جلد ۳ رجسٹرڈ ایل نمبر ۳۶۰ ے عدد ۲

ماہنامہ

میثاق

لاہور

زیر ادارت

امین احسن اصلاحی

دفتر رسالہ میثاق

رحمان پورہ ۔ اچھرہ ۔ لاہور (پاکستان)

سالانہ چندہ چھ روپے قیمت فی پرچہ دس آنے

رجسٹرڈ ایل نمبر ۷۳۶۰

ہندوستانی خریداروں کے لیے ارسال زر کا پتہ
مینیجر "الفرقان" کچہری روڈ لکھنؤ

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد ۳ | بابت ماہ اگست ۱۹۶۰ء مطابق صفر المظفر ۱۳۸۰ھ | عدد ۲

فہرست مضامین

تذکرہ و تبصرہ ———— امین احسن اصلاحی ———— ۲

تدبر قرآن

تفسیر سورۂ بقرہ ———— " ———— ۹

اجتماعیات و سیاسیات

اسلامی قومیت کے عوامل ———— " ———— ۲۱

مقالات

خانہ کعبہ کی اہمیت کے اسباب ———— ضیاء الدین صاحب اصلاحی ———— ۳۷

مراسلہ و مذاکرہ

اہل سنت کے فرقوں میں رواداری ــــ کیا موجودہ زمانہ میں اسلامی نظام کا امکان ہے؟ ــــ کیا فرشتے غیر مکلف ہیں؟ ———— امین احسن اصلاحی ———— ۴۵

تقریظ و تنقید ———— ۵۲

محی الدین پرنٹر پبلشر نے اشرف پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ میثاق ۱۱۔ احمد سٹریٹ رحمان پورہ اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

تذکرہ و تبصرہ

۱۲ جولائی سنہ ۶۰ء کو صدر ریاست فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ کا افتتاح کرتے ہوئے انسٹی ٹیوٹ کے گورنروں کے بورڈ کے سامنے جو تقریر فرمائی ہے وہ مختلف اعتبارات سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اگرچہ اس تقریر کا پورا متن کسی اخبار میں ہماری نظر سے نہیں گذرا، صرف اس کا خلاصہ ہی ہمارے سامنے آیا ہے لیکن اس سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی میں اسلام کو ایک متحرک طاقت بنانے کے اسی طرح خواہشمند ہیں جس طرح ایک سچے اور پکے مسلمان کو ہونا چاہیے۔

انھوں نے جمود اور عامیانہ تقلید کی سخت مذمت کرتے ہوئے زندگی کے تقاضوں کو سمجھنے، ان کا ساتھ دینے اور ان کے مطالبات پورے کرنے پر پورا زور دیا ہے، لیکن ساتھ ہی نہایت ہی پرزور الفاظ میں یہ تنبیہہ بھی کی ہے کہ یہ کام مذہب کے اعلیٰ اصولوں کو قربان کرکے نہیں ہونا چاہیے۔ یہ تنبیہہ ان لوگوں کے لیے بہت ضروری تھی جو سمجھتے ہیں کہ مذہب تو مولویوں کے جمود کے سبب سے اپنے اصولوں سے منحرف ہو گیا ہے لیکن زندگی کے طور طریق میں ان کے نزدیک کوئی انحراف واقع نہیں ہوا ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ زندگی تو صحیح شاہراہ پر مارچ کر رہی ہے البتہ مذہب پیچھے رہ گیا ہے، اسے چاہیے کہ وہ ہماری زندگی کا ساتھ دے

اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ پوری بیدردی کے ساتھ مذہب کے اصولوں پر ہاتھ صاف کر رہے ہیں، حالانکہ انصاف یہ ہے کہ جس طرح اجتہاد کے تعطل نے ہماری زندگی کو جمود میں مبتلا کیا ہے، اسی طرح مغرب کی کورانہ تقلید نے ہمیں بے راہ روی اور آوارہ گردی میں مبتلا کیا ہے۔ اس وجہ سے ایک طرف اگر اس بات کی ضرورت ہے کہ مذہب زندگی کے تقاضوں کے ساتھ مطابقت پیدا کرے تو دوسری طرف اس سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہماری زندگی مذہب کے ساتھ مطابقت پیدا کرے۔ جب یہ بات پیدا ہوگی تب ہی اعتدال و توازن کی وہ صحیح حالت وجود میں آئے گی جس کی طرف صدر ریاست نے اشارہ فرمایا ہے، ورنہ زندگی کے مطالبات اور تقاضوں کے ساتھ مذہب کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش میں مذہب کا تیا پانچہ ہو کے رہ جائے گا کیونکہ اس زمانہ میں جیسا کہ ہم نے عرض کیا، زندگی کے ہر گوشہ میں مغربیت کا فساد گھس چکا ہے اور یہ فساد مذہبی جمود کے فساد سے کہیں زیادہ ضررناک ہے اس وجہ سے اگر ایک طرف مذہب میں حرکت پیدا کرنے کی ضرورت ہے تو دوسری طرف جیسا کہ ہم نے عرض کیا، زندگی کے موجودہ رخ کو بھی موڑنے کی شدید ضرورت ہے۔

صدر ریاست نے اسلام کے اعلیٰ اصولوں کا صرف اجمالاً ہی ذکر نہیں فرمایا ہے بلکہ بڑی وضاحت کے ساتھ قرآن مجید اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا حوالہ بھی دیا ہے۔ اس سے یہ حقیقت بالکل آشکارا ہو کر سامنے آگئی ہے کہ اسلامی اصول و مبادی اور اسلامی قانون و احکام کے ان دونوں ماخذوں پر ان کا اسی طرح ایمان ہے جس طرح پوری امت ان پر ایمان رکھتی ہے۔ وہ اس زمانہ کے منکرین سنت کی طرح اللہ اور اس کے رسول، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں کوئی فرق نہیں کرتے ۔ قرآن مجید کے متعلق انھوں نے فرمایا ہے کہ جب وہ اس کو پڑھتے ہیں تو ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ ان کی یہ حالت خود ان کے لیے بھی قابل مبارک باد ہے اور اس مملکت کے لیے بھی قابل مبارک باد ہے جس کے وہ سربراہ ہیں۔ جن کے دلوں میں قرآن کی یہ عزت و عظمت ہوگی ان سے یہ اندیشہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ وہ اس خدا داد مملکت میں خدا کے قانون کے سوا کوئی اور قانون جاری و نافذ

کریں گے۔

سنت رسول اللہ کا ذکر انھوں نے قرآن کے بعد اسلامی اصول و مبادی کے دوسرے ماخذ کی حیثیت سے کیا ہے۔ یہ بات فرما کر انھوں نے اس زمانے کے سب سے بڑے فتنے کی سرکوبی کی ہے۔ جو لوگ قرآن، قرآن پکارتے ہیں اور سنت رسول اللہ کا انکار کرتے ہیں وہ درحقیقت پورے دین کے دشمن ہیں اور اس امت کے اندر وہ ایسی تفریق کا بیج بو رہے ہیں جو اگر خدانخواستہ برگ و بار لائے تو پھر اس امت کے بنیان مرصوص بننے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ جاتا ہے۔ وہ ذات جو امت کے اندر سب کی عقیدت کا مرجع ہے، جس کے ذکر محبوب سے ہر دل کے اندر جوش ایمان اور جذبہ خدا پرستی پیدا ہوتا ہے، جس کے تعلق نے دلوں کو جوڑا ہے اور جس کی نسبت نے باہمدگر پیوستگی پیدا کی ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے اس ذات کو اس امت کے اندر جو جگہ حاصل ہے اگر وہاں سے اس کو ہٹا دیا جائے تو اس امت کی عمارت کی بنیاد ہی اکھڑ جائے گی اسی وجہ سے جو لوگ آج نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی سنت کی مخالفت کر رہے ہیں وہ ہمارے مذہب اور ہمارے ملک دونوں کی جڑیں کھودنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس غلط فہمی کے سبب سے ان کے حوصلے بہت بڑھتے جا رہے تھے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس ملک کے کارفرماؤں کا خیال بھی وہی ہے جو ان کا ہے اور اس غلط فہمی کے لیے فی الواقع کچھ اسباب بھی تھے لیکن صدر ریاست کی اس تقریر نے واضح کر دیا کہ وہ ہماری اجتماعی زندگی کی تشکیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ اور آپ کی سنت کو وہی اہمیت دیتے ہیں جو اہمیت فی الواقع ان کی ہے۔

صدر ریاست نے اس امر کو بھی اپنی اس تقریر میں واضح فرمایا ہے کہ پاکستان کے دونوں بازوؤں کو جو چیز باہمدگر جوڑتی ہے وہ درحقیقت دین ہی کا عنصر ہے، یہی چیز ہے جس نے چٹاگانگ سے لے کر درۂ خیبر تک کے مسلمانوں کو پاکستان کے نصب العین پر مجتمع کیا ہے اور یہی چیز ہے جو ان کو اس نصب العین پر مجتمع رکھ سکتی ہے۔ یہ راز اگرچہ معلوم عوام ہے، اس ملک کا ہر باشندہ، جس کو اس ملک کی تاریخ کا کچھ پتہ ہے، اس امر واقعی سے واقف ہے، لیکن ہمارے اندر ایک طبقہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو دین کو اس ملک کی ترقی میں حارج سمجھتا ہے۔

ایسے لوگوں کے لیے صدر ریاست کی یہ تنبیہ شاید مفید ثابت ہو۔ وہ دین کی ہمدردی کے پہلو سے نہیں تو اپنے ملک کی سالمیت کے پہلو سے اس مسئلہ پر غور کرنے پر آمادہ ہوں کہ پاکستان میں لے دینی اور الحاد کی اشاعت کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ جو چیز اس کے مختلف اجزا کو ایک دوسرے کے ساتھ باندھے ہوئے ہے اسی کو ختم کر دیا جائے۔

صدر ریاست کی تقریر کے یہ پہلو روشن ہیں اور ہم امید کرتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام کے مستقبل سے جو لوگ دلچسپی رکھتے ہیں (اور الحمد للہ اس ملک کی عظیم اکثریت ایسے ہی لوگوں پر مشتمل ہے) انھوں نے اس تقریر سے نہایت اچھا اثر لیا ہوگا لیکن بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو اس قسم کی مفید تقریروں کے اچھے اثرات کو یا تو دلوں سے زائل کر دیتی ہیں یا انتہائی حد تک کم کر دیتی ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان باتوں پر بھی نگاہ رکھی جائے تاکہ لوگ ان تقریروں کو محض سیاسی تقریروں کا درجہ نہ دیں بلکہ ان سے پورا پورا فائدہ حاصل کریں اور اس راہ پر بڑھنے کے لیے ان کے اندر حوصلہ پیدا ہو جس کی طرف صدر ریاست نے اشارہ فرمایا ہے۔

اس قسم کی باتوں میں سے ایک قابل توجہ چیز تو خود اس بورڈ کی تشکیل کی نوعیت ہے۔ اس بورڈ کا جو مقصد صدر ریاست نے واضح فرمایا ہے اور جس کی مزید وضاحت وزیر تعلیم کی اسی موقع کی تقریر سے ہوتی ہے اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ بورڈ صرف کچھ اکیڈمک کے قسم کے مسائل پر بحث و تحقیق کے لیے وجود میں نہیں آیا ہے بلکہ اس کے پیش نظر وہ عظیم کام ہے جس کے لیے صحیح تعبیر ہمارے ہاں تجدید دین و احیائے اسلام کی ہے۔ اگر ہم نے یہ مقصد سمجھنے میں غلطی نہیں کی ہے تو ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس عظیم اور مقدس کام کی انجام دہی کے لیے جو لوگ منتخب کیے گئے ہیں وہ شاید ہی اس کی ذمہ داریوں سے صحیح طور پر عہدہ برا ہو سکیں۔ ہمیں ان حضرات کے علم و فضل سے انکار نہیں ہے لیکن موجودہ دور کے تقاضوں اور کتاب و سنت کے تقاضوں میں ایسی سازگاری پیدا کرنا کہ نہ کتاب و سنت کے اصول

مجروح ہوں، نہ وقت کے مطالبات نظر انداز ہوں، ایک نہایت نازک کام ہے جس کو وہی لوگ بحسن و خوبی انجام دے سکتے ہیں جن کو دین میں بھی پوری پوری بصیرت حاصل ہو اور جو وقت کے تقاضوں کو بھی بخوبی سمجھتے ہوں اور ساتھ ہی ان میں تقویٰ اور احتیاط بھی ہو تاکہ مسلمان ان کے اجتہادات اور ان کی راؤں پر اعتماد کریں۔

ہمارے سامنے ابھی اس بورڈ کا پورا طریقہ کار نہیں آیا ہے اس وجہ سے ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ اپنے مشکل اور عظیم کام کو کس طرح انجام دے گا تاہم اتنی بات ہم ظاہر کردینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر اس بورڈ نے بھی قسم کے اداروں کو اپنے مقصد کی تکمیل کا ذریعہ بنایا جو مختلف ناموں سے ہمارے ملک میں ہر غالب ہوجانے والی برائی کو دین کی سند فراہم کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں تو یہ چیز اس بورڈ کی خدمات کی طرف سے لوگوں کو بہت مایوس کرے گی۔ ان اداروں نے جس نظریہ پر اب تک کام کیا ہے وہ وہی ہے جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کرچکے ہیں۔ یعنی انھوں نے یہ فرض کر رکھا ہے کہ ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی میں مغربی تہذیب اور مغربی علوم کے زیر اثر جو برائیاں داخل ہوچکی ہیں وہ سب اچھائیاں ہیں اور بالکل وقت کے تقاضوں کے تحت داخل ہوئی ہیں۔ اب اگر مذہب ان کا ساتھ نہیں دیتا تو یہ مذہب کا قصور نہیں ہے بلکہ مولویوں کا جمود ہے۔ اس کے بعد وہ مغربی زندگی کے ان فتنوں کو دین ثابت کرنے کے لیے دین کے ساتھ جو معاملہ کررہے ہیں اس کو ہر انصاف پسند دیکھ کر فیصلہ کرسکتا ہے کہ یہ دین کی اور اسلامی معاشرہ کی خدمت ہے یا اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ بدترین قسم کی دشمنی۔

جہاں تک دین کی تجدید اور اسلام کے احیا کے ارادہ کا تعلق ہے ہم دل سے اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ چیز پاکستان کے قیام کے مقاصد میں سے ہے اور ہمیں دلی خوشی ہوگی اگر پاکستان اس راہ میں عالم اسلامی کی رہنمائی کے لیے آگے بڑھے لیکن یہ عظیم کام صحیح طور پر اسی صورت میں انجام پا سکتا ہے جب اس کو دین اور دنیا دونوں کے تقاضوں کو سمجھنے والے دلی تعاون کے ساتھ انجام دیں اور ان کے

پیش نظر صرف اللہ کی رضا اور اس کے دین کی سربلندی ہو۔ اگر یہ کام خام قسم کے نوجوانوں سے محض اس اعتماد پر لینے کی کوشش کی گئی کہ ان کے پاس ڈاکٹریٹ یا ایم اے کی سند ہے تو اس سے نہ صرف یہ کہ وہ مقصد نہیں حاصل ہوگا جس کی طرف صدر ریاست نے اشارہ فرمایا ہے بلکہ ان خام تحقیقات سے ایک سخت قسم کا ذہنی اور فکری انتشار پیدا ہوگا جو ہماری قوم کے لیے موجودہ فکری جمود سے بھی زیادہ مضر ہوگا۔

اس بورڈ سے علماء کا بالکل الگ رکھا جانا ایک ایسا معاملہ ہے جس کی معقول توجیہ سے ہمارا ذہن بالکل قاصر ہے۔ ہمارے ملک میں خدا کے فضل سے ایسے علماء موجود ہیں جو اس مقصد کی نہایت بہتر طریقہ پر خدمت کر سکتے ہیں جو اس بورڈ کا بنایا گیا ہے۔ ان کی علمی و مذہبی خدمات اس بات کی شاہد ہیں کہ وہ دین اور دنیا دونوں کے تقاضے سمجھتے ہیں اور مسلمانوں کو ان کے کام پر اعتماد ہے۔ ایسے لوگوں کو بالکل نظر انداز کر کے صرف ایک ہی طرز فکر کے لوگوں پر مشتمل جو بورڈ بنایا گیا ہے وہ دین و دنیا کی ہم آمیزی کے اس مشکل کام میں وہ اعتدال و توازن کس طرح قائم رکھ سکے گا جس کے قائم رکھنے پر صدر ریاست نے اس قدر زور دیا ہے۔ اس بورڈ کے اصل مقصد کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس میں دین کے ماہرین صرف بطور تبرک شامل نہ ہوتے بلکہ بورڈ کی اکثریت انہی پر مشتمل ہوتی لیکن اگر علماء کے متعلق یہ خیال ہے کہ وہ دنیا کے تقاضوں کو نہیں سمجھتے تو کم از کم دین کے جاننے والوں کی حیثیت سے تو اس میں ان کی موثر نمائندگی ضروری تھی۔ ہم صدر ریاست سے گذارش کریں گے کہ وہ اس بورڈ کی اس کمی کی اصلاح فرمائیں۔ یہ گذارش ہم اس لیے نہیں کر رہے ہیں کہ اس بورڈ میں شمولیت علماء کا کوئی حق ہے جو انھیں ملنا چاہیے بلکہ صرف اس لیے کر رہے ہیں کہ جو کام پیش نظر ہے وہ علماء کی شمولیت کے بغیر موثر اور نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔

آخر میں ہم وہ گذارش پھر کریں گے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ جس طرح ضرورت اس وقت مذہب کو متحرک بنانے کی ہے اسی طرح ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ زندگی کو اسلام کی طرف

موڑا جائے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں اس کے برعکس رجحان پایا جاتا ہے۔ جو برائیاں ہمارے یہاں محتاج اصلاح تھیں ہم ان کو کلچر اور ثقافت وغیرہ کے مہذب ناموں سے مزید چمکانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض لوگ ان کو شریعت کی سند بھی عطا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس طرح کی باتیں ہیں جو ذہنوں میں الجھن پیدا کر دیتی ہیں اور جن سے نہایت مفید تقریروں کے اثرات بالکل زائل ہو کر رہ جاتے ہیں۔

بقیہ سورۃ بقرہ

کیونکہ مشرک یہ سمجھتا ہے کہ اوّل تو خدا اپنے شرکاء کے لحاظ میں اس کے اوپر ہاتھ ہی نہیں ڈالے گا اور اگر ڈالے گا تو اس کے شرکاء اس کو اپنی سعی و سفارش سے بچا لیں گے۔

تفویض کا پہلو یہ ہے کہ اللہ کے عہد بندگی پر قائم رہنے والوں کو جو مشکلیں اور اذیتیں پیش آتی ہیں وہ ہر چیز کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کرتے ہیں اس لیے کہ انھیں یہ اعتماد ہوتا ہے کہ وہ جس کی راہ میں یہ سب کچھ جھیل رہے ہیں، ہر قدم پر اسی کی طرف بڑھ رہے ہیں، پھر جب آگے وہ ہے جس کی طلب ہے، تو پیچھے کے اس سارے شور و غوغا کی کیا پروا۔

کیا غم ہے اگر ساری خدائی ہو مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

اطلاع: بعض خریدار دفتر سے خط و کتابت کرتے وقت صرف اپنا نام لکھتے ہیں اور خریداری نمبر کا حوالہ نہیں دیتے، اس سے دفتر کو انھیں جواب لکھنے میں کافی زحمت ہوتی ہے۔ اس لیے خریدار حضرات سے درخواست ہے کہ وہ دفتر سے خط و کتابت کرتے وقت ہمیشہ اپنا نام و پتہ خوشخط لکھیں اور خریداری نمبر کا حوالہ بھی ضرور دیں۔

مینیجر میثاق لاہور

تدبر قرآن

امین احسن اصلاحی

تفسیر سورۂ بقرہ

(۱۳)

رکوع کے معنی آگے کی طرف جھک پڑنے، تواضع ظاہر کرنے اور فقر و غربت سے پست ہو جانے کے ہیں۔ قرآن مجید میں اس سے مراد نماز ہوتی ہے اس لیے کہ یہ نماز کے اہم ترین ارکان میں سے ہے۔ اس کے ساتھ مع الراکعین (رکوع کرنے والوں کے ساتھ) کی قید نماز باجماعت کی اہمیت اور اس کی تاکید کو ظاہر کرتی ہے۔ اگرچہ نماز باجماعت کا مفہوم اقیموا الصلوٰۃ کے الفاظ کے اندر بھی موجود ہے لیکن مخاطب کے خاص حالات کی وجہ سے اس مضمون کو واضح الفاظ میں الگ بھی بیان کر دیا ہے۔

نماز قائم کرنے، زکوٰۃ دینے اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرنے کے اس حکم کے مخاطب جیسا کہ سیاق کلام سے واضح ہے، یہود ہیں، اور اشارہ ان کے عوام و خواص سب کی طرف ہے۔ جس عہد الٰہی کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے اس کے بنیادی احکام یہی تھے اور یہود نے ان کو بالکل ترک کر رکھا تھا۔ قرآن مجید نے یہاں یہود کو ان احکام کے ازسرِنو زندہ کرنے کی طرف توجہ دلائی اور اشارہ اس بات کی طرف بھی کر دیا کہ انھوں نے عہد الٰہی کے ان بنیادی احکام کو بالکل ختم کر رکھا ہے لیکن صرف اشارہ کیا، اس بات کو صراحت کے ساتھ نہیں کہا تاکہ وہ بحث و تردید کے لیے نہ اُلجھ پڑیں۔

یہود کے متعلق یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ انھوں نے نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کے احکام تقریباً ختم

کردیئے تھے۔

جہاں تک نماز کا تعلق ہے اس کا حکم تو ان کے صحیفوں میں سرے سے موجود ہی نہیں ہے یہاں تک کہ ان کے ایک فرقے کا تو یہ خیال ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اس چیز کا حکم دیا ہی نہیں تھا، یہ محض بعد والوں کی بدعت ہے۔

زکوٰۃ کا اگرچہ انھوں نے انکار تو نہیں کیا لیکن ان کے علماء، اور کاہنوں نے اس کا مصرف فقراء اور مساکین کے بجائے اپنے آپ کو قرار دے لیا۔ چنانچہ کتاب احبار، جس میں کاہنوں کے حقوق و فرائض اور نذر اور قربانیوں وغیرہ کا بیان ہے، فقراء اور مساکین کے ذکر سے بالکل خالی ہے۔ پیداوار کے عشر، پہلوٹھی کے فدیے اور ہر قسم کی نذریں اس میں کاہنوں کے لیے مخصوص کردی گئی ہیں اور اس طرح زکوٰۃ کے اصلی حقدار فقراء، اور غرباء کے بجائے علماء، اور کاہن ہی کے رہ گئے ہیں۔ قرآن مجید نے نماز اور زکوٰۃ دونوں معاملوں میں شریعت الٰہی کا موقف بھی واضح کیا اور یہود کی زیادتیوں پر نہایت واضح الفاظ میں ان کو ملامت بھی کی۔

نماز کے متعلق قرآن مجید نے یہ واضح کیا کہ سب سے پہلی چیز جو یہود پر فرض کی گئی وہ نماز ہی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو توحید کی تعلیم کے بعد سب سے پہلا حکم نماز ہی کا دیا گیا۔ چنانچہ ارشاد ہے :-

إِنَّنِي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي ۱۴۔ طٰہٰ	بیشک میں ہی اللہ ہوں، نہیں ہے کوئی معبود مگر میں سو میری ہی بندگی کرو اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر

دوسری جگہ فرمایا :-

وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ وَأَخِيهِ أَن تَبَوَّآ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوتًا وَاجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قِبْلَةً وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ (۸۷۔ یونس)	اور ہم نے موسیٰؑ اور اس کے بھائی کی طرف وحی کی کہ تم اپنی قوم کے لیے مصر میں گھر مقرر کرلو اور اپنے گھروں کو قبلہ بناؤ اور نماز قائم کرو۔

ان آیات سے صاف واضح ہے کہ یہود کی جماعتی شیرازہ بندی سب سے پہلے نماز باجماعت کے ذریعہ ہی سے ہوئی تھی لیکن اس کی اہمیت بعد میں انھوں نے بالکل ختم کردی۔

وارکعوا مع الراکعین کے الفاظ کی روشنی میں استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے دو حقیقتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ایک اس حقیقت کی طرف کہ یہاں یہود کو رکوع کرنے کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ انھوں نے رکوع کو بالکل ترک کر دیا تھا[1]

دوسرے نماز با جماعت کے اہتمام کی طرف، وہ اس طرح کہ لیڈروں کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ نمازوں میں غربا اور عوام کے ساتھ شریک ہوں اور ان کے پہلو بہ پہلو کھڑے ہوں، کیونکہ پہلی چیز جو نماز کو ڈھانے والی ہے وہ یہی ترک جماعت ہے۔ امرار عوام کے ساتھ مسجدوں کی حاضری کو کسرشان سمجھنے لگتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نماز کی عزت کم ہو جاتی ہے اور مسجدوں کی حاضری صرف غربا کے ساتھ مخصوص ہو جاتی ہے۔ نماز با جماعت کی اسی اہمیت کے سبب سے اللہ تعالیٰ نے حضرت مریمؑ کو بھی جماعت کے اہتمام کی تاکید فرمائی۔

یا مریم اقنتی لربک واسجدی وارکعی مع الراکعین	اے مریم اپنے رب کی فرماں بردار رہ اور سجدہ اور رکوع کر رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔
(۴۳۔ آل عمران)	

اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسکم وانتم تتلون الکتاب	'بر' کا لفظ عربی زبان میں ایفائے عہد، وفاداری اور ادائے حقوق کے معنی میں آتا ہے۔ حقوق میں ہر قسم کے

حقوق شامل ہیں، بنیادی اور حقیقی بھی، مثلاً خدا کی فرمانبرداری، والدین کی اطاعت اور خلق کے ساتھ ہمدردی پھر آگے چل کر اس میں وہ حقوق بھی شامل ہو جاتے ہیں جو قول و قرار اور معاہدات سے پیدا ہوتے

[1] استاذ امام رحمۃ اللہ کے نزدیک یہود اپنے اور سال میں صرف ایک مرتبہ سجدہ کرنا واجب سمجھتے تھے اور اس کے لیے بھی ان کے علماء نے یہ اجازت دے رکھی تھی کہ اگر کوئی شخص کھڑے کھڑے کسی دیوار یا کھمبے پر اپنی پیشانی رکھ دے تو ادائے فرض کے لیے یہ بھی کافی ہے۔ معلوم نہیں مولاناؒ کے اس بیان کا ماخذ کیا ہے لیکن تورات میں یہود کو بار بار جو گردن کش کہا گیا ہے اس کی وضاحت ان کے اسی طرز عمل کی روشنی میں بخوبی ہو جاتی ہے۔

ہیں۔ اسی وجہ سے یہ لفظ احسان اور نیکی کی تمام قسموں پر بھی حاوی ہے اور عدل کا بھی ہم معنی ہے۔ اپنے استعمالات کے لحاظ سے یہ لفظ اثم (حق تلفی) عقوق (والدین کی نافرمانی) غدر (بے وفائی) اور ظلم کا ضد ہے۔ بَرٌّ اور بَارٌّ اس سے صفت کے صیغے استعمال ہیں مثلاً کہیں گے بَرٌّ بِوَالِدِہٖ وہ اپنے باپ کا فرمانبردار ہے۔ بَرَّ بِالْقَسَمِ کے معنی ہیں اس نے اپنی قسم پوری کی۔ قرآن مجید میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی تعریف میں وارد ہے وَکَانَ تَقِیًّا وَّبَرًّا بِوَالِدَیْہِ وَلَمْ یَکُنْ جَبَّارًا عَصِیًّا ۱۴۔ مریم، (وہ پرہیزگار اور اپنے ماں باپ کا فرمانبردار تھا، سرکش اور نافرمان نہ تھا۔) دوسری جگہ فرمایا ہے لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۹۲۔ آل عمران۔ (تم خدا کی فرمانبرداری کا حقیقی درجہ نہیں حاصل کر سکتے جب تک کہ ان چیزوں میں سے نہ خرچ کرو جن کو تم محبوب رکھتے ہو) اللہ تعالیٰ کی تعریف میں ہے اِنَّہٗ ھُوَ الْبَرُّ الرَّحِیْمُ ۲۸ طور (بے شک وہ اپنے وعدوں کو پورا کرنے والا اور مہربان ہے۔ نیز فرمایا ہے، وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ، ۔ ۲۔ مائدہ (اور تعاون کرو ایفائے حقوق اور تقویٰ کے کاموں میں اور نہ تعاون کرو حق تلفی اور تعدی کے کاموں میں) اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ بِرّ کا لفظ ایک پہلو سے نیکی اور بھلائی کے تمام کاموں پر مشتمل ہے لیکن اپنے خاص مفہوم کے لحاظ سے یہ حقوق اور فرائض کے ایفاء کے لیے آتا ہے۔

اس آیت کے مخاطب یہود کے علماء اور اکابر ہیں۔ آخر کا ٹکڑا وانتم تتلون الکتاب، (اور حال یہ ہے کہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو) ہمارے اس خیال کی نہایت واضح طور پر تائید کر رہا ہے۔ ان علماء اور اکابر کو مخاطب کر کے یہ بات کہی جارہی ہے کہ تم عوام کو تو بڑے زوروں سے حقوق اور فرائض کے ادا کرنے کی تلقین کرتے ہو لیکن یہ تلقین کرتے وقت اپنے آپ کو بالکل بھول جاتے ہو۔ لوگوں کو تو نصیحت کرتے ہو کہ اپنے مال تمہارے حوالہ کریں لیکن خود تمہارے اوپر خدا کے اور غریبوں کے جو حقوق ہیں ان کا خیال تمہیں کبھی نہیں آتا، بلکہ تم لوگوں کا دبا ہوا مال ہڑپ کر کے بیٹھ جاتے ہو۔ تم نے دوسروں پر تو اپنی اطاعت پوری سطوت کے ساتھ واجب کر رکھی ہے، یہاں تک کہ تم ان کے رب بن بیٹھے ہو لیکن خود خدا کی اطاعت اور اس کی فرمانبرداری سے بالکل آزاد ہو، نماز اور زکوٰۃ کو ضائع کر کے

تم نے پورے دین کو بالکل برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ علمائے یہود کی اس حالت کی طرف حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی نہایت بلیغ الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے:۔

"اس نے کہا اے شرع کے عالمو، تم پر بھی افسوس کہ تم ایسے بوجھ جن کا اٹھانا مشکل ہے آدمیوں پر لادتے ہو اور آپ ایک انگلی بھی ان بوجھوں کو نہیں لگاتے"۔ لوقا باب ۱۱ ۔ ۴۶

غور کیجیے، انجیل کے ان الفاظ اور قرآن مجید کے مذکورہ بالا الفاظ میں کتنی مطابقت ہے!

دانتم تتلون الکتاب (اور حال یہ ہے کہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو) یعنی تم دین و شریعت کے عالم ہو اور جانتے ہو کہ از روئے عقل و نقل تم پر شریعت کی ذمہ داریاں دوسروں کی نسبت سے کہیں زیادہ ہیں۔

واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ | لفظ صلوٰۃ کی تحقیق بقرہ کی آیہ ۳ کی تفسیر کرتے ہوئے بیان ہو چکی ہے اس وجہ سے یہاں ہم صرف لفظ صبر کی تحقیق پر کفایت کریں گے۔

لفظ صبر کے اصل معنی روکنے کے ہیں یعنی نفس کو گھبراہٹ، مایوسی اور دل برداشتگی سے بچا کر اپنے موقف پر جمائے رکھنا۔ قرآن مجید میں اسی حقیقت نے کچھ زیادہ پاکیزہ صورت اختیار کرلی ہے۔ یعنی قرآن میں عموماً اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ بندہ پوری طمانیت قلب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے عہد پر ڈٹا رہے اور اس کے وعدوں پر یقین رکھے اور اس راہ میں اس کو جن مشکلات سے بھی دوچار ہونا پڑے ان کو پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہ دے۔

صبر کا مفہوم لوگ عام طور پر عجز و مسکنت سمجھتے ہیں لیکن لغت عرب اور استعمالات قرآن میں اس کا یہ مفہوم نہیں ہے۔ استاذ امام اپنی تفسیر سورہ والعصر میں کلام عرب کی روشنی میں اس عام خیال کی تردید مندرجہ ذیل الفاظ میں فرماتے ہیں:

"لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ عربوں کے نزدیک صبر عجز و تذلل کے قسم کی کوئی چیز نہیں ہے جو بے بسوں اور درماندوں کا شیوہ ہے بلکہ یہ عزم اور قوت کی بنیاد ہے۔ کلام عرب میں اس کا استعمال بہت ہے اور اس کے تمام استعمالات سے اسی مفہوم پر روشنی پڑتی ہے حاتم طائی کہتا ہے؛

وغمرة موت ليس فيها هوادة — يكون صدور المشرفي جسورها

اور موت و ہلاکت کے کتنے ہولناک دریا ہیں جن پر تلواروں کے پل ہیں۔

صبرنا له في نهكها ومصابها — باسيافنا حتى يبوخ سعيرها

ہم نے ان کے تمام آفات و شدائد کے مقابل اپنی تلواروں کے ساتھ ثابت قدمی دکھلائی، یہاں تک کہ وہ ٹھنڈے پڑ گئے۔

يا ابن الجحاجحة المدارة — والصابرين على المكاره،

اے شریف سرداروں اور شدائد پر صبر کرنے والوں کی اولاد

زہیر بن سلمیٰ نے کہا ہے:

قود الجياد واصهار الملوك وصبر — في مواطن لو كانوا بها سئموا

اصیل گھوڑوں کی سواری، بادشاہوں کی دامادی اور ایسے مورچوں میں ثابت قدمی جہاں دوسرے ہمت ہار بیٹھیں۔

صبر کے اصلی معنی قرآن مجید نے خود بھی واضح کر دیئے ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے:۔

وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ — اور ثابت قدمی دکھانے والے سختی میں،

وَحِينَ الْبَأْسِ — تکلیف میں اور لڑائی کے وقت

اس آیت میں صبر کے تین موقعے ذکر کیے ہیں۔ غربت، بیماری اور جنگ اور درحقیقت تمام مصائب و شدائد کے سرچشمے یہی تین ہیں۔[1]

اوپر عہد الٰہی کو از سر نو استوار کرنے کے لیے بنی اسرائیل کو جن باتوں کا حکم دیا ہے یا جن سے روکا ہے ان کا اختیار کرنا یا ان سے بچنا نفس کے لیے نہایت شاق ہے اس وجہ سے وہ نسخہ بھی بتا دیا ہے جو اس مشکل کام کو آسان بنا سکتا ہے۔ یہ نسخہ صبر اور نماز کے دو چیزوں پر مشتمل ہے۔ ان دو چیزوں کے اختیار کرنے سے نفس کے لیے یہ چڑھائی آسان ہو جاتی ہے۔ صبر کا تعلق اخلاق و کردار سے ہے اور نماز کا تعلق عبادات

---

[1] تفسیر سورہ والعصر مولانا فراہیؒ فصل ٦

سے ہے۔ انسان کے اندر اگر مشکلات و موانع کے علی الرغم حق پر ڈٹے رہنے کی خصلت موجود نہ ہو تو وہ دنیا میں کوئی اعلیٰ کام تکمیل تک نہیں پہنچا سکتا، لیکن مشکلات و موانع کے علی الرغم کسی صحیح موقف پر ڈٹے رہنے کی خصلت انسان کے اندر آسانی سے نہیں پیدا ہوتی بلکہ ریاضت سے پیدا ہوتی ہے جس کا طریقہ نماز ہے۔ آدمی اگر ایک صحیح راہ پر چلنے کا عزم کرلے اور اس پر چل کھڑا ہو اور ساتھ ہی برابر اپنے رب کو یاد رکھے اور اس سے مدد مانگتا رہے (جس کی بہترین شکل نماز ہے) تو اس کے عزم کی قوت ہزار گنی بڑھ جاتی ہے، کوئی مشکل سے مشکل حالت بھی اس کے پائے ثبات میں لغزش پیدا ہونے نہیں دیتی، اگر حالات کی نزاکت سے آدمی کے پاؤں لڑکھڑانے لگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کا وہ تعلق جو نماز کے واسطے سے قائم ہوتا ہے، اس کو گرنے سے بچا لیتا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہاں صبر کا جو حکم دیا ہے وہ اس لیے دیا ہے کہ اس وصف کو پیدا کیے بغیر کوئی قوم اللہ تعالیٰ کے عہد پر قائم نہیں رہ سکتی اور نماز کا حکم اس لیے دیا ہے کہ یہی چیز صبر کے پیدا کرنے، اس کو ترقی دینے اور اس کو درجہ کمال تک پہنچانے کا وسیلہ و ذریعہ ہے۔ آگے ان آیات پر تدبر کے سلسلہ میں چونکہ اس مسئلہ پر ہم تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے اس وجہ سے یہاں صرف اشارہ پر کفایت کرتے ہیں۔

استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں ایک دوسرے پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے، اگرچہ اس کو ہم نے اختیار نہیں کیا ہے لیکن ہے وہ نہایت لطیف۔ آگے ہم اس کی وضاحت کریں گے۔

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ | اس ٹکڑے میں سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وَاِنَّهَا میں ھا کا مرجع کیا ہے؟ مجاہد کے نزدیک اس کا مرجع صلوٰۃ ہے۔ اسی قول کو امام ابن جریرؒ نے ترجیح دی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ نماز نفس پر بہت بھاری ہے، صرف وہی لوگ اس بارگراں کو اٹھا سکتے ہیں، جن کے اندر خدا کا خوف ہو اور جن کے دل آخرت کی بازپرس کے ڈر سے ہروقت خدا کے آگے جھکے رہتے ہوں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس کا مرجع وہ ہدایت و نصیحت ہے جو پچھلے جملہ میں مذکور ہوئی ہے۔

استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ پہلے قول کے حق میں ہیں اور اس کی تائید میں انھوں نے چند دلیلیں بھی پیش کی ہیں۔ ان کے نزدیک یہاں صبر کو نظر انداز کرکے، صرف نماز کے بھاری اور مشکل ہونے کے ذکر کرنے کی

تین وجہیں ہیں۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ صبر کا شاق اور گراں ہونا بالکل واضح تھا اس وجہ سے اس کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی مثال میں وہ آیت واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ ان اللہ مع الصابرین[1]، پیش کرتے ہیں کہ اس میں یہ فرمایا کہ اللہ صابروں کے ساتھ ہے، یہ نہیں فرمایا کہ نماز پڑھنے والوں کے ساتھ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز میں اللہ تعالیٰ کی معیت کا حاصل ہونا اس قدر واضح ہے کہ اس کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی۔ اسی طرح صبر کا مشقت طلب ہونا چونکہ واضح تھا اس وجہ سے اس کا ذکر نہیں کیا، صرف نماز کا ذکر کیا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ صبر نماز کے لازمی شرائط میں سے ہے۔ صرف وہی لوگ نماز پر قائم رہ سکتے ہیں جن کے اندر صبر کی خصلت موجود ہے۔ نماز کی اس خصوصیت کو سامنے رکھ کر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ جب یہ بات کہہ دی گئی کہ نماز ایک بھاری اور مشکل چیز ہے تو گویا اس کے بھاری اور مشکل ہونے کے پہلو کی طرف خود بخود اشارہ ہو گیا، کہ یہ اس وجہ سے بھاری اور مشکل ہے کہ اس کے لیے صبر درکار ہے۔ اس اشارہ نے صبر کے تصریح کے ساتھ ذکر کرنے کی ضرورت سے مستغنی کر دیا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ صبر کا ایک سخت چیز ہونا چونکہ واضح ہے اس وجہ سے اس کی سختی کا اظہار کرتے ہوئے اس کا حکم دینا مخاطب کی طبیعت پر گراں گذرتا اس وجہ سے اس کی سختی کا حوالہ نہیں دیا، صرف نماز کی سختی کا حوالہ دیا جو بظاہر ایک آسان چیز ہے۔

یہ نکتے اگرچہ نہایت لطیف ہیں اور ان سے زیر بحث آیت کے بعض نہایت اہم گوشے روشنی میں آتے ہیں لیکن میرا اپنا رجحان دوسرے قول کی طرف ہے۔ یعنی ھا کا مرجع میرے نزدیک صبر و صلوٰۃ سے استعانت کی وہ تلقین ہے جو اوپر والے ٹکڑے میں وارد ہوئی ہے۔ عربی زبان اور قرآن مجید میں اس اسلوب بیان کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔ ہم قرآن مجید سے چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔ فرمایا۔

---

[1] مدد چاہو صبر اور نماز کے ذریعہ سے، بے شک اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہے۔ ۱۵۳ بقرہ

وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللَّهِ خَيْرٌ لِّمَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا وَلَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الصَّابِرُونَ ۸۰۔ قصص

اور جن لوگوں کو علم عطا ہوا تھا انھوں نے کہا، تمہارا برا ہو، اللہ کا اجر ایمان لانے والوں اور عمل صالح کرنے والوں کے لیے ان چیزوں سے کہیں بہتر ہے لیکن ایمان اور عمل صالح کا مرتبہ نہیں عطا ہوتا مگر ان لوگوں کو جو صبر کرنے والے ہوں۔

☆

دوسری جگہ فرمایا ہے :۔

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ۔ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ (۳۴ - ۳۵ - حم سجدہ)

اور بھلائی اور برائی دونوں یکساں نہیں ہو سکتیں، تم ان کی برائی کو بھلائی سے دفع کرو تو تم دیکھو گے کہ جس کے درمیان اور تمہارے درمیان شدید عداوت ہے، وہ تمہارا سرگرم حامی بن گیا ہے اور یہ حکمت نہیں عطا ہوتی مگر ان لوگوں کو جو صبر کریں اور یہ دانش نہیں ملتی مگر نصیبہ ور کو

علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں ای وما یلقی ھذہ الوصیۃ الا الذین صبروا وما یلقاھا ای یوتاھا ویلھمہا الا ذو حظ عظیم (یعنی یہ ہدایت نہیں عطا ہوتی مگر ان لوگوں کو جو صبر کرنے والے ہوں۔ وما یلقاھا کے معنی ہیں کہ یہ ہدایت نہیں ملتی یا نہیں الہام ہوتی مگر ان کو جو بڑے نصیب والے ہوں)

اس قول کو اختیار کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ اس میں ھا کی ضمیر کا تعلق صرف نماز سے نہیں رہ جاتا بلکہ صبر اور نماز دونوں سے ہو جاتا ہے۔ یہ بات عربی زبان کے قواعد کے بھی مطابق ہے اور اصل حقیقت کے بھی کیونکہ نفس پر شاق درحقیقت یہ دونوں ہی چیزیں ہیں۔ صبر کے مشکل ہوتے میں تو کسی کو کلام ہو ہی نہیں سکتا۔ نماز بھی مداومت اور پابندی کی شرط کے ساتھ اتنی سخت چیز بن جاتی ہے کہ اہل توفیق ہی ہیں جو اس کو نباہ سکتے ہیں۔

"لکبیرۃ" کبیرۃ کے معنی یہاں بھاری، ثقیل اور شاق کے ہیں۔ قرآن مجید میں دوسرے مواقع پر بھی

یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ (۱۴۳ البقرہ) لیے شک بھاری چیز ہے مگر ان کے لیے جن کو خدا ہدایت دے دے) وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ (۳۵۔ انعام) (اور اگر ان کا اعراض تم پر گراں گزر رہا ہے)

الا علی الخاشعین، خشوع کی اصل حقیقت پستی اور فروتنی اور عجز و تذلل ہے۔ آواز پست ہو تو یہ لفظ اس کے لیے بھی بولا جائے گا، نگاہ جھکی ہوئی ہو تو اس کے لیے بھی بولا جائے گا، اونٹ کا کوہان لاغری کے سبب سے بیٹھ جائے تو اس کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہو گا۔

اوپر عہد الٰہی پر استوار رہنے کے لیے صبر اور نماز سے استعانت کی جو نصیحت کی گئی ہے اس کے متعلق یہ فرمایا گیا کہ یہ راہ سہل انہی کے لیے ہے جن میں خشوع ہو، جو خدا سے ڈرنے والے ہوں، جو غرور و سرکشی کی بیماری سے پاک ہوں اور جن کے دل خدا کے حضور جواب دہی کے تصور سے ہر وقت اندیشہ ناک رہتے ہوں۔ وہ لوگ اس راہ پر نہیں چل سکتے جن کے سینے خوف خدا سے خالی ہوں، جو قومی و نسلی غرور کے گھمنڈ میں مبتلا ہوں اور جو خدا اور آخرت سے زیادہ اپنی امارت وسیادت کی ساکھ جمائے رکھنے کی فکروں میں مبتلا ہوں۔

یہ خشوع صبر اور نماز دونوں کی بنیاد ہے۔ صبر سے یہاں مراد، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، ہر طرح کے مصائب و شدائد اور ہر قسم کے ایذاء و استخفاف کے باوجود خدا کے عہد پر جمے رہنا ہے اور یہ بات وہی شخص کر سکتا ہے جس کے دل پر خدا کی ایسی ہیبت و عظمت طاری ہو کہ اس کے مقابل میں ہر مصیبت و ذلت اس کو ہیچ معلوم ہوتی ہے۔

اسی طرح نماز کے متعلق ہر صاحب علم پر یہ حقیقت واضح ہے کہ اس کی بنیادی خشوع و خضوع پر ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ایک سے زیادہ مقامات میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے۔ مثلاً :-

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خٰشِعُوْنَ (۱۔ مومنون)	ان مومنوں نے فلاح پائی جو اپنی نماز میں عاجزی کرتے ہیں۔

دوسرے مقام میں ہے :-

وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ (۹۰ انبیاء)	وہ ہمیں پکارتے ہیں امید و بیم کے ساتھ اور وہ ہم سے عاجزی کرنے والے ہیں۔

یظنون انھم ملاقوا ربھم | آدمی کسی چیز کے متعلق اس کے دیکھے بغیر جو رائے قائم کرتا ہے اس کو ظن کہتے ہیں۔ اس طرح کی رائے پر بالعموم چونکہ یقین نہیں ہوا کرتا اس وجہ سے ظن کا لفظ کچھ شک کے ہم معنی سا بن گیا ہے۔ چنانچہ عربی زبان اور قرآن مجید میں یہ لفظ اس معنی میں بہت استعمال ہوا ہے۔ طرفہ کا مشہور شعر ہے :-

واعلم علما لیس بالظن انہ　　　اذا ذل مولی المرء فھو ذلیل

(میں ایک بات جانتا ہوں جو محض گمان نہیں ہے کہ جب آدمی کا چچا زاد بھائی ذلیل ہو جائے تو وہ خود بھی ذلیل ہو کر رہ جاتا ہے۔)

اسی طرح قرآن مجید میں ہے اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَیْقِنِیْنَ (۳۲ جاثیہ) (ہم محض ایک گمان کر رہے ہیں اور ہم یقین کرنے والے نہیں ہیں)

لیکن ایک بن دیکھی چیز کے متعلق جو رائے قائم کی جاتی ہے ضروری نہیں کہ وہ مشکوک ہی ہو، بسا اوقات یہ رائے یقین پر مبنی ہوتی ہے لیکن ظن کا لفظ اس کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ ظن کا یہ استعمال اس کے عام معنی کے لحاظ سے ہوتا ہے، اس میں شک کا مفہوم مضمر نہیں ہوتا۔ اوس بن حجر کا ایک شعر ہے :-

الالمعی الذی یظن بک الظن　　　کان قد رای وقد سمعا

(وہ ذہین کہ اگر تمہارے بارے میں کوئی گمان بھی کرے تو معلوم ہوتا ہے دیکھ کر اور سن کر کرتا ہے)

درید بن صمہ کہتا ہے :-

فقلت لھم ظنوا بالفی مدجج　　　سراتھم فی الفارسی المسرد

(میں نے ان سے کہا کہ دو ہزار سلاح پوش سواروں کا یقین کرو جن کے سردار باریک کڑیوں کی زرہیں پہنے ہوں گے)

یہ خاشعین کی مزید تعریف ہے کہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے اور اپنے رب سے ملنے کا گمان رکھتے ہیں، آخرت سے بے پروا اور بے فکر نہیں ہیں۔

خاشعین کی تعریف میں یہ بات ان کے باطن پر روشنی ڈالتی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے اوپر عجز و مسکنت اور پستی و فروتنی کی جو حالت طاری ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دلوں میں آخرت کا خوف اور خدا کے سامنے حاضری کا ڈر سمایا ہوا ہے۔

خاشعین کی اس باطنی حالت کی تعبیر کے لیے ظن کے لفظ کے استعمال میں ایک خاص خوبی یہ ہے کہ یہ لفظ اندیشہ اور گمان غالب سے لے کر یقین اور قطعیت تک کی حالت کی تعبیر کے لیے کافی ہے اور آخرت کا معاملہ ایک ایسا اہم معاملہ ہے کہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی کو جب اس کے بارہ میں یقین حاصل ہو جائے تب ہی اس کے لیے تیاری کرے، بلکہ اس کا اندیشہ اور گمان بھی اس بات کے لیے کافی ہے کہ آدمی اس کے لیے تیار رہے۔ ایک عظیم بند جس کے ٹوٹ جانے سے پورے شہر کے ڈوب جانے کا اندیشہ ہو ہماری توجہ کا طالب صرف اسی صورت میں نہیں ہوتا جب کہ پانی اس کی دیواروں میں دراڑیں پیدا کر دے بلکہ اس کے ٹوٹنے کے ہولناک اندیشہ کے پیش نظر اس وقت بھی اس کی حفاظت کا اہتمام ہوتا ہے جب کہ وہ بظاہر بالکل محفوظ ہوتا ہے۔ ایک چھوٹے سے خطرے کے معاملہ میں جب انسان کی پیش بینی کا یہ حال ہے تو آخر مرنے کے بعد کی زندگی اور آخرت کے معاملہ میں جس کا تعلق ایک ابدی زندگی سے ہے، وہ اتنا بے حس اور بلید کیوں ہو جائے کہ اس کے تمام آثار و علامات سے آنکھیں بند کیے ہوئے رہے اور اس وقت تک اس کے لیے کسی تیاری کی ضرورت نہ سمجھے جب تک اس کو اس کا پورا پورا یقین نہ ہو جائے۔

وانھم الیہ راجعون "اور یہ کہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں" کے الفاظ بیک وقت توحید اور تفویض کی دو حقیقتوں کو ظاہر کر رہے ہیں۔

توحید کا پہلو یہ ہے کہ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ آخرت میں سارے معاملات صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کے سامنے پیش ہوں گے، وہی جزا اور سزا دے گا، اور وہ جو کچھ دے گا پورے عدل و انصاف کے ساتھ دے گا، کسی دوسرے کی مجال نہ ہوگی کہ اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکے یا اس کے غضب سے بچا سکے۔ یہ مضمون الیہ کی تقدیم سے پیدا ہوتا ہے اور اس توحید کا حوالہ یہاں اس لیے ضروری ہوا کہ اگر عقیدۂ شرک کا کوئی شائبہ دل میں موجود رہے تو خدا کی ملاقات کا عقیدہ بالکل بے جان ہو کر رہ جاتا ہے (باقی صفحہ)

اجتماعیات و سیاسیات

امین احسن اصلاحی

اسلامی قومیت کے عوامل

(۳)

اسلام میں قومیت کی اساس اوپر یہ بات وضاحت سے ثابت ہو چکی ہے کہ اسلام قومیت کے معروف عوامل میں سے کسی عامل کو بھی بے داغ اور مفاسد سے پاک تسلیم نہیں کرتا اس وجہ سے ان میں سے کسی کو بھی یہ درجہ نہیں دیتا کہ اس پر معاشرت اور تمدن کی بنیاد رکھ دی جائے اور اس کو ایک سیاسی نظام کے لیے اساس کار کی حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ان عوامل میں سے کسی عامل کو بھی اسلام میں یہ حیثیت حاصل نہیں ہے کہ وہ قومیت کی بنیاد بن سکے تو آخر اسلام میں قومیت کی بنیاد ہے کیا چیز؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام میں قومیت کی بنیاد خود اسلام ہے۔ جو شخص اسلام کو قبول کر لیتا ہے وہ اسلامی قومیت کا ایک جزو بن جاتا ہے، جو شخص اسلام کو قبول نہیں کرتا وہ اسلامی قومیت کا جزو نہیں بن سکتا۔

یہ حقیقت اگرچہ ایک بالکل واضح حقیقت ہے جس میں کسی شک شبہ کی گنجائش نہیں ہے لیکن قومیت کے جدید نظریات اب دماغوں پر اس طرح مسلط ہو چکے ہیں کہ دوسرے تو درکنار خود مسلمان بھی اب اس بات میں شک کرنے لگے ہیں کہ اسلام میں قومیت کی اساس خود اسلام ہی ہے، جب تک کوئی شخص کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار نہ کرے اس وقت تک اس کو اسلامی قومیت میں بحیثیت ایک شریک مساوی کے شامل ہونے کی سعادت حاصل نہیں ہوتی۔ عرب قوم جس کو خدا کے اس آخری دین کے حامل اول ہونے کا شرف حاصل ہوا، سب سے پہلے دنیا میں اس حقیقت کا اعلان کرنے والی بنی تھی کہ اسلام میں قومیت کی

اساس اسلام کے اصول و عقائد ہیں نہ کہ نسل یا زبان یا وطن یا اس طرح کی کوئی اور چیز۔ اسلام اپنے عقلی اور فطری اصولوں کے سوا کسی چیز کا بھی یہ درجہ تسلیم نہیں کرتا کہ وہ انسان اور انسان کے درمیان کسی فرق و اختلاف کی بنیاد بن سکے لیکن اب اسی قوم کے اندر یہ تحریک اٹھ رہی ہے کہ عربی نسل اور عربی زبان کو عربی قومیت کی بنیاد ہونا چاہیے، ان کے سوا کسی چیز کو بھی یہ اہمیت حاصل نہیں ہونی چاہیے کہ وہ عربی زبان بولنے والوں کے درمیان قومیت کا کوئی فرق پیدا کر سکے۔

یہ صورتِ حال تقاضا کر رہی ہے کہ اصل حقیقت واضح کرنے کے لئے ہم یہاں کچھ دلائل بھی پیش کریں اور ضروری ہے کہ یہ دلیلیں نقلی اور عقلی دونوں طرح کی ہوں تاکہ مسلمان بھی ان سے مطمئن ہو سکیں اور ان لوگوں کے شبہات بھی دور ہو سکیں جو مذہب کو، خواہ وہ کوئی بھی ہو، قومیت کی اساس ماننے میں طرح طرح کے خطرے محسوس کرتے ہیں۔

قومیت کے معاملے میں انبیاء علیہم السلام کا عمل

قومیت کے معاملے میں نہ صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بلکہ تمام انبیاء کا عمل ہمیشہ ایک ہی رہا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر نبی خاتم صلی اللہ علیہ وسلم تک کی جو تاریخ قرآن میں بیان ہوئی ہے وہ اس حقیقت کو بالکل غیر مبہم طور پر واضح کر رہی ہے، کہ اگرچہ تمام انبیاء کرام نسل، نسب اور زبان اور وطن سے بنی ہوئی قومیتوں ہی کے اندر سے اٹھے، تاہم انھوں نے اس قومیت کو کبھی جائز تسلیم نہیں کیا۔ جائز تسلیم نہ کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جن عوامل سے اس قومیت کی تشکیل ہوتی ہے ان عوامل کے فطری حقوق بھی انھوں نے تسلیم نہیں کیے۔ جہاں تک ان کے فطری حقوق اور مطالبات کا تعلق ہے ان کو نہ صرف یہ کہ انھوں نے تسلیم کیا بلکہ دوسروں سے کہیں زیادہ تسلیم کیا، اپنے ہم نسبوں اور ہم وطنوں کے لیے ایک شخص کے دل میں جو محبت و ہمدردی ہونی چاہیے وہ انبیاء علیہم السلام کے دل میں سب سے زیادہ تھی، وہ اپنی اپنی قوموں کے سب سے زیادہ خیر خواہ اور سب سے زیادہ غم خوار تھے اور ہمیشہ اپنی قوم کو "اے میری قوم" کے محبت بھرے خطاب ہی سے مخاطب کرتے تھے تاہم کسی نبی نے بھی اپنی قوم کے بارے میں یہ اعلان نہیں کیا کہ فلاں نسل و نسب کے لوگ ایک قوم ہیں اس وجہ سے ان کے درمیان کسی عقیدہ یا نظریہ کی بنا پر کوئی تفریق نہیں ہونی چاہیے یا فلاں زبان

بولنے والے سب ایک قوم ہیں اس وجہ سے انھیں لسانی بنیاد پر دوسروں کے مقابل میں اپنے آپ کو منظم کرنا چاہیے یا فلاں پہاڑ سے لے کر فلاں دریا تک سارے بسنے والے ایک متحدہ قومیت کے اجزاء ہیں جو شخص ان کے درمیان عقیدہ یا مسلک کی بنا پر کوئی فرق پیدا کرتا ہے وہ انتشار پسند ہے۔ اس طرح کی کوئی بات ہمیں کسی نبی سے بھی منقول نہیں ملتی اور نہ کسی نبی نے کبھی یہی کہا کہ "میں اپنی قوم کا ساتھی ہوں خواہ میری قوم حق پر ہو یا باطل پر۔"

ایک قوم کو اپنے بزرگوں سے، اپنی زبان سے اور اپنی نسل سے جو موانست ہوتی ہے اور اس کی بنا پر قوم کے ہر فرد کے اندر ان کی طرف منسوب ہونے والی چیزوں سے جو محبت ہو جاتی ہے یا ہونی چاہیے انبیاء علیہم السّلام اس سے اچھی طرح باخبر تھے اور اپنی دعوت میں انھوں نے اس فطری اپیل سے فائدہ بھی اٹھایا ہے لیکن اس سے زیادہ نہیں کہ اگر ایک چیز عقل اور فطرت کے اعتبار سے حق ہوئی ہے اور حسن اتفاق سے اس کے پیچھے کوئی اس طرح کی تاریخ بھی ہوئی ہے تو انھوں نے اس سے فائدہ اٹھا لیا ہے، اس نسبت کو بجائے خود کسی چیز کے حق ہونے کی بنیاد تسلیم نہیں کیا ہے۔ مثلاً اسلام کے متعلق قرآن نے عربوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یہ تمہارے جدامجد حضرت ابراہیمؑ کا دین ہے (مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ) نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے بارے میں یہ فرمایا ہے کہ یہ تمہاری اپنی قوم کے اندر سے اٹھے ہیں یا امیوں کے اندر سے اٹھے ہیں، یا خود قرآن کے متعلق اللہ تعالےٰ کا یہ ارشاد ہے کہ یہ عربی زبان میں نازل ہوا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ باتیں اسی مقصد سے کہی گئی ہیں کہ عربوں کو اس ملت، اس پیغمبر اور اس قرآن کی طرف راغب کیا جائے لیکن محض اس دلیل کی بنا پر نہیں کہ اسلام ان کے باپ کا دین ہے، یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کی اپنی قوم کے ایک لیڈر ہیں یا قرآن خود ان کے ادب کا ایک شاہکار ہے بلکہ ان کی حقانیت کے نہایت واضح اور قطعی دلائل قرآن میں الگ بیان ہوئے ہیں اور یہ دلائل تمام تر عقلی اور فطری ہیں، ان عقلی و فطری دلائل پر مزید اضافہ یہ بھی ہے، کہ جہاں تک عربوں کا تعلق ہے انھیں ان چیزوں سے قومی تعلق کی بنا پر بھی لگاؤ ہونا چاہیے۔

صرف یہی نہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السّلام نے نسل و نسب یا زبان اور وطن کے نعرہ پر لوگوں کو

متحد اور منظم ہونے کی دعوت نہیں دی بلکہ ان اساسات پر قائم شدہ تنظیموں کو انھوں نے توڑا اور توڑ کر ازسر نو ان کو ایمان اور عقیدہ کی بنیاد پر قائم کرنے کی دعوت دی اور اگر ان کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی ہے تو وہ اپنی اپنی قوموں کو چھوڑ کر اور ان سے اعلان برأت کر کے الگ ہو گئے ہیں اور جس سرزمین پر بھی ان کو ایمان او رعقیدہ کی بنیاد پر ایک ملی تنظیم کے مواقع حاصل ہوئے ہیں انھوں نے وہاں اپنے مقصد کے لیے جدوجہد کی ہے۔ اس حقیقت کا ثبوت یوں تو ہر نبی کی زندگی سے فراہم ہوتا ہے لیکن ہم طوالت سے بچنے کے لیے صرف تین جلیل القدر انبیاء حضرت نوح، حضرت ابراہیم اور حضرت محمد صلی اللہ علیہم وسلم کی زندگیوں سے اس کی مثالیں پیش کرتے ہیں :-

حضرت نوح علیہ السّلام کا اسوہ حضرت نوح علیہ السّلام نے اپنی قوم کو جو دعوت دی وہ قرآن میں یوں نقل ہوئی ہے :-

"اس نے کہا اے میری قوم کے لوگو! میں تمہارے لیے خدا کی طرف سے ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں اور یہ دعوت دیتا ہوں کہ اللہ ہی کی بندگی کرو، اسی سے ڈرو اور میری بات مانو" (۲-۳ نوح)

یہ دعوت جس دل سوزی جس سرگرمی اور جس جوش سے انھوں نے دی اور ان کی قوم نے اس دعوت کے ساتھ جو سلوک کیا اس کی تصویر خود انہی کے الفاظ میں قرآن مجید نے جو پیش کی ہے اس کا ترجمہ ملاحظہ ہو :-

"اس نے دعا کی کہ اے میرے رب میں نے اپنی قوم کو رات دن پکارا مگر میری دعوت نے ان کے گریز ہی میں اضافہ کیا۔ میں نے جب ان کو مغفرت کی دعوت دی تاکہ تو انھیں بخشے، انھوں نے اپنے کانوں میں اپنی انگلیاں ٹھونس لیں، اپنے اوپر اپنی چادریں لپیٹ لیں اور ضد اور گھمنڈ کا مظاہرہ کیا۔ پھر میں نے اُن کو کھل کر پکارا۔ پھر میں نے ان کو ظاہر میں بھی سمجھایا اور پوشیدہ طور پر بھی سمجھایا میں نے کہا کہ اپنے رب سے مغفرت مانگو، وہ بخشنے والا ہے" (۵-۱۰ سورہ نوح)

قوم کے سامنے جو دعوت اس ہمدردی اور اس دل سوزی کے ساتھ پیش کی گئی جب قوم نے وہ دعوت رد کر دی تو قوم کے ساتھ حضرت نوح کی وہی محبت جو دعوت کے لفظ لفظ سے ٹپک رہی ہے بیزاری

اور اعلانِ براءت کی شکل میں تبدیل ہوگئی اور انھوں نے اس قوم کو ہلاک ہونے کے لیے چھوڑ دیا اور اس کی جگہ پر انھوں نے ایک الگ جمعیت بنائی جو صرف ان لوگوں پر مشتمل تھی جو خدا کو ماننے والے اور اس کے غضب سے ڈرنے والے تھے۔ یہی جمعیت بعد میں ان کی تعلیم و دعوت کی وارث بنی اور اس سے مختلف قومیں وجود میں آئیں:۔

" اور نوح نے دعا کی کہ اے میرے رب تو زمین پر کافروں میں سے ایک بھی چلتا پھرتا نہ چھوڑ اگر تو ان کو چھوڑے گا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور یہ صرف نابکاروں اور ناشکروں ہی کو جنم دیں گے ۔ اے میرے رب مجھ کو بخش ، میرے ماں باپ کو بخش اور ان کو بخش جو میرے گھر میں ایمان کے ساتھ داخل ہوجائیں اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کو بخش اور ظالموں کے لیے تباہی کے سوا کچھ اور نہ بڑھا" (۲۶ - ۲۸ نوح)

حضرت نوح علیہ السلام کی اس قوم کے اندر وہ تمام عناصر قومیت موجود تھے جو ایک نسلی اور وطنی قومیت کے ضروری اجزا سمجھے جاتے ہیں ۔ یہ واضح طور پر ایک نسل کے لوگ تھے۔ ایک ہی زبان بولتے تھے۔ جغرافی یکجائی نے ان کا سیاسی اور معاشی مفاد بالکل مشترک بنا دیا تھا، ان کا ایک آبائی دین بھی تھا جس میں ود، سُواع ، یَغوث ، یعوق اور نسر نامی دیوتاؤں کی پوجا ہوتی تھی ان کے اندر صاحب مال و اولاد لیڈر بھی تھے اور سورہ نوح کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ وقت کی تمام سیاسی چالوں سے اچھی طرح واقف بھی تھے ۔ قومیت کے عام تصور کو اگر سامنے رکھا جائے تو اُن ساری چیزوں سے یہ قوم لیس تھی جو ایک قوم کو قوم بنانے کے لیے مطلوب ہیں ۔ حضرت نوحؑ کے الفاظ صاف شہادت دے رہے ہیں کہ ان کو اپنی اس قوم سے نہایت گہری محبت بھی تھی۔ اگر ان کو محبت بھی تھی تو آخر انھوں نے اس پوری قوم کو توڑ پھوڑ کر کیوں رکھ دیا ؟ اگر ان کو اپنی قوم کی ترقی قومی حیثیت سے مطلوب تھی تو اس کے لیے صحیح طریقہ یہی ہوسکتا تھا کہ وہ قومیت کے انہی عوامل میں سے کسی عامل کو بھڑکاتے جن سے ان کی قوم کو جذباتی وابستگی تھی ۔ آخر ان کی قوم کے قوم پرست لیڈر ۔ وَدّ ۔ سواع ، یغوث اور یعوق کا حوالہ دے کر لوگوں کو حضرت نوح کے خلاف بھڑکاتے ہی تھے کہ یہ شخص ان مقدس قومی

معبودوں کی پرستش سے انہیں برگشتہ کرکے تمہاری قومی جمعیت کو پارہ پارہ کر رہا ہے ، اسی طرح کا کوئی قومی حربہ حضرت نوح علیہ السلام بھی اپنی قوم کو بھڑکانے کے لیے استعمال کر سکتے تھے لیکن انھوں نے اس قسم کے کسی فتنے کا سہارا نہیں لیا بلکہ سیدھے سیدھے لوگوں کو خدا کی طرف بلایا اور جو لوگ خدا کے کلمہ پر مجتمع ہو گئے تھے ان کے سوا سب کو انھوں نے چھوڑ دیا۔

حضرت ابراہیمؑ کا اعلان برأت اسی طرح نسل و نسب اور زبان اور وطن کے اشتراک سے بنی ہوئی ایک قوم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم بھی تھی اور انھیں بھی اس قوم سے نہایت گہری محبت تھی لیکن اس محبت کے باوجود وہ اس بات پر راضی نہ ہوئے کہ ان عناصر سے بنی ہوئی کسی قوم کے اندر وہ اپنی زندگی کے دن گذارتے رہیں یا اس کے اوپر اپنی لیڈری جمانے کے خواب دیکھیں بلکہ انھوں نے اپنی اس قوم کو ان غلط بنیادوں سے ہٹا کر توحید اور خالص خدا پرستی کی بنیاد پر منظم کرنے کی کوشش کی لیکن جب قوم نے ان کی بات نہ مانی تو وہ سب کو چھوڑ کر ایک دوسری سرزمین کی طرف ہجرت کر گئے اور اپنی اولاد میں سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ایک بے آب و گیاہ صحرا میں بسایا اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی کہ ان کی نسل سے وہ اپنی ایک فرماں بردار امت اٹھائے جس کی تعمیر نسل و نسب اور زبان و وطن کے بجائے خالص توحید اور خدا پرستی کی بنیاد پر ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو چھوڑتے وقت جو الفاظ فرمائے ہیں وہ قرآن مجید میں جس طرح نقل ہوئے ہیں ان کا ترجمہ یہ ہے :-

"تمہارے لیے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کے رویے میں ایک اچھی مثال ہے - جب کہ انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور ان سے جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو بالکل بے تعلق ہیں ۔ ہم نے تمہارے دین کا انکار کیا اور ہمارے اور تمہارے درمیان اس وقت تک کے لیے عداوت اور دشمنی آشکارا ہو گئی جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ" (ممتحنہ)

مذکورہ آیت میں یہ بات خاص طور پر لحاظ رکھنے کی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف قوم کے دین بت پرستی ہی سے بیزاری کا اعلان نہیں کیا بلکہ خود قوم سے بھی کامل بے تعلقی کا اعلان

کر دیا اور یہ بھی واضح کر دیا کہ ان تعلقات کی بحالی کی واحد شرط یہ ہے کہ تم ایک ہی اللہ پر ایمان لاؤ۔ یہ اس بات کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ وہ نہ تو کسی ایسی قومیت کا تصور رکھتے تھے جس میں دین کو بالکل خارج از بحث رکھ کر محض نسلی اور وطنی عوامل کی مدد سے ایک قومیت کا کنبہ جوڑ لیا جائے اور نہ وہ کسی غلط دین پر قومیت کی شیرازہ بندی کا کوئی تصور رکھتے تھے۔

<u>نبی کریمؐ کا اسوۂ حسنہ</u> نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت جس قوم کے اندر ہوئی تھی وہ نسلی اور نسبی عصبیت کے اعتبار سے دنیا کی ایک ممتاز ترین قوم تھی، اس کو اپنی زبان پر بڑا فخر تھا، اس کو اپنے وطن پر بھی بڑا ناز تھا، اپنی روایات اور اپنے دین بت پرستی کے ساتھ بھی اس کو عشق تھا اور انہی عناصر سے اس کی عربی قومیت کی شیرازہ بندی ہوئی تھی۔ یہ چیزیں اہل عرب کے رگ و ریشے میں اس طرح سرایت کیے ہوئے تھیں کہ ان کے اندر ان چیزوں کا سہارا لیے بغیر کسی بڑے سے بڑے لیڈر کے لیے بھی کوئی اصلاح کا کام کرنا ممکن نہ تھا لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم سے انتہائی محبت رکھنے کے باوجود نہ صرف یہ کہ ان چیزوں کا کوئی سہارا نہیں لیا بلکہ آپؐ کی دعوت کی پہلی ہی صدا عربی قومیت کے ان تمام عناصر کے لیے ایک ضرب کاری کا حکم رکھتی تھی۔

آپؐ کی قوم کا آبائی دین بت پرستی تھا اور اس دین کو ان کی شیرازہ بندی میں بڑا دخل تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اعلان کر کے سب سے پہلے اس کے باطل ہونے کا اعلان کیا۔

آپؐ کی قوم کو اپنی زبان اور اپنے نسلی شرف کا بھی بڑا گھمنڈ تھا اور اس کی قومی شیرازہ بندی میں اس چیز کو بھی بڑا دخل تھا، آپؐ نے اپنے مختلف اعلانات کے ذریعہ سے ان کے اس پندار کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اس بارے میں قرآن مجید کی آیتوں کے ترجمے ہم اوپر نقل کر آئے ہیں۔ یہاں چند حدیثوں کے ترجمے پیش کرتے ہیں:—

"نہ کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت ہے اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر۔ تم سب یکساں آدم کی اولاد ہو۔"
(بخاری و مسلم)

" نہ کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت ہے اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر، نہ کسی گورے کو کسی کالے پر فضیلت ہے اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر۔ اگر فضیلت ہے تو تقویٰ کی بنا پر" (زاد المعاد)

" اے قوم قریش، اللہ نے تمہاری جاہلیت کی نخوت اور باپ دادا پر تمہارے گھمنڈ کو ختم کر دیا۔"

آپؐ کی قوم کو اپنے وطن سے بھی بڑا گہرا لگاؤ تھا اور ان کی شیرازہ بندی میں اس وطن کی عظمت و محبت کو بھی بڑا دخل تھا۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس وطن سے نہایت گہری محبت تھی۔ لیکن آپؐ نے اسلام کے لیے اس محبوب وطن کو چھوڑا اور یہ کہہ کر چھوڑا کہ " اے مکہ تو مجھے دنیا کی ہر جگہ سے زیادہ عزیز ہے لیکن کیا کروں تیرے فرزند مجھے یہاں رہنے نہیں دیتے "۔ یہ گویا حضورؐ کی طرف سے اس حقیقت کا ایک عملی اعلان تھا کہ وطن بڑی چیز ہے لیکن پھر بھی اس کا یہ درجہ نہیں ہے کہ ایمان اور عقیدہ کو بھی اس کے تابع کر دیا جائے۔

آپؐ کی قوم کو اپنی روایات پر بھی بڑا ناز تھا اور ان روایات کو بھی ان کی قومی شیرازہ بندی میں بڑا دخل تھا۔ لیکن نبی کریمؐ نے خطبہ حجۃ الوداع میں تمام غلط روایات کا یہ کہہ کر خاتمہ کر دیا کہ :-

" یاد رکھو کہ جاہلیت کے تمہارے تمام مفاخر اور خون اور مال کے تمام دعوے آج میرے ان قدموں کے نیچے ہیں "۔

نسل و نسب اور زبان اور وطن سے بنی ہوئی قومیتوں میں ساری اہمیت انہی چیزوں کو حاصل ہوتی ہے اور قوم کے ہر فرد سے یہ چاہا جاتا ہے کہ ان کی محبت کے نشے میں اس طرح سرشار رہے کہ ان کے خلاف ایک لفظ بھی نہ سن سکے اور جب کبھی ان پر کوئی آنچ آتے دیکھے تو ان کی حمیت و حمایت میں مرنے اور مارنے کے لیے تیار ہو جائے۔ عربی زبان میں اسی چیز کو عصبیت کہتے ہیں اور کسی قومیت کا استحکام اسی عصبیت پر منحصر ہوتا ہے لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عصبیت کا بھی یہ اعلان کر کے خاتمہ کر دیا کہ :-

" جو عصبیت پر مرا وہ ہم میں سے نہیں ہے، جس نے عصبیت کا نعرہ لگایا وہ ہم میں سے نہیں ہے، جو کسی عصبیت کے تحت لڑا وہ ہم میں سے نہیں ہے "۔

یہاں یہ حقیقت بھی ملحوظ رکھنی چاہیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ان تمام اقدامات پر نسلی اور وطنی قومیت کے علم بردار برابر چراغ پا ہوتے رہے اور آپؐ کو قوم دشمن اور انتشار پسندی کے طعنے دے دے کر اس کے بُرے نتائج سے آپ کو ڈراتے بھی رہے لیکن حضورؐ نے ان کی سُنی ان سنی کر دی اور برابر ایمان و عقیدہ کی بنیاد پر ایک نئے معاشرہ کی تعمیر میں لگے رہے۔

مکہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعوت دی قریش اس کو برابر انتشار پسندی اور تخریب سے تعبیر کرتے رہے۔ اس کے بعد جب حضورؐ نے مدینہ کو ہجرت فرمائی تو قریش نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ شخص اپنی قوم کو چھوڑ کر دوسروں سے جا ملا ہے اور جو شخص اپنی قوم کو چھوڑتا ہے بالآخر اس کی جڑ کٹ کے رہتی ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر قریش آپؐ کو "ابتر" کہتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو لوگ خدا کے لیے قوم کو چھوڑتے ہیں وہ ابتر نہیں ہوتے۔ ابتر وہ ہوتے ہیں جو قوم کے لیے خدا کو بھی چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ اس کے بعد جب بدر کا معرکہ پیش آیا اور قریش نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دین اور عقیدہ کے سوال نے فی الواقع قریش کو قریش ہی کے خلاف صف آرا کر دیا ہے تو ابوجہل، جو قریشی قومیت کا سب سے بڑا علم بردار تھا، یہ منظر دیکھ کر بوکھلا اٹھا اور اس نے اسی وقت للکار کے یہ دعا کی کہ "اے خدا جس نے اس قطع رحم کی بنا ڈالی ہے تو اس کو شکست دینا" اگرچہ اللہ تعالیٰ کو رحم کی پاس داری جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں نہایت پسند ہے مگر اللہ تعالیٰ کے حقوق رحم کے حقوق سے بھی کہیں بڑھ کر ہیں اس وجہ سے اس نے ان لوگوں کو فتح دی جو اللہ کے دین کے لیے رحم اور نسب کے سارے روابط سے بے پروا ہو گئے تھے۔ اور ان لوگوں کو اس معرکے میں شکست ہوئی جو نسل و نسب کے تعصبات کے پیچھے خدا کو بھی بھول بیٹھے تھے۔

الغرض اپنی قوم کی تمام مخالفتوں کے باوجود آپؐ نے ایک ایسا معاشرہ قائم کر دیا جس میں نسل اور وطن کے بجائے تمام اہمیت ایمان اور عقیدہ کو حاصل ہوئی، جس میں ایک حبشی یا ایک رومی کے لیے تو اونچی سے اونچی جگہ بھی اگر وہ اللہ کے دین کو اپنا لے لیکن ایک قریشی اور ہاشمی کے لیے کوئی جگہ بھی نہیں تھی اگر وہ خدا کے دین کو نہ مانے۔ ایمان اور عقیدہ کی اساس پر قائم ہونے والے اس معاشرہ میں نسلی اور وطنی

عوامل کی جگہ ہجرت اور نصرت کے عوامل نے کام کیا۔ جو لوگ اپنی قوم اور اپنے وطن کے اندر اپنے دین و ایمان کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتے تھے ان کو یہ حکم ہوا کہ وہ اپنی قوم اور اپنے وطن کو چھوڑ کر وہاں ہجرت کر جائیں جہاں کی فضا ان کے دین و ایمان کے لیے سازگار ہے اور جو لوگ اپنے دلوں کی طرح اپنے ماحول کو بھی ایمان و اسلام کے نور سے منور کر چکے تھے ان کو یہ حکم ہوا کہ وہ اپنے اُن دینی بھائیوں کی ہر طرح مدد کریں جو ان کی طرف ہجرت کر کے آئیں۔ ہجرت کرنے والوں نے اپنے عزیزوں، رشتہ داروں اور اپنے اس وطن کو چھوڑا جس کے اندر وہ اپنے دین کے سبب سے بیگانہ بن کے رہ گئے تھے اور ان لوگوں کو اپنا بھائی اور عزیز بنایا جو دین میں ان کے شریک بن چکے تھے۔ مدد کرنے والوں نے اپنے ان عزیزوں اور رشتہ داروں کو چھوڑا جن سے وہ خون اور نسب اور ہم وطنی کے رشتے رکھتے تھے لیکن دین میں ان سے مختلف ہو گئے تھے اور ان کو چھوڑ کر ساری محبتیں اور ساری جاں نثاریاں ان لوگوں کے لیے وقف کرنے پر آمادہ ہو گئے جن سے اگرچہ وہ خون اور ہم وطنی کا اشتراک نہیں رکھتے تھے لیکن ایمان و اسلام کے رشتے نے اب ان کو ایک کر دیا تھا۔

اس ہجرت اور نصرت نے ایک نئے معاشرہ کی بنیاد رکھ دی۔ مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخاۃ کا نہایت گہرا تعلق قائم ہو گیا۔ انصار نے اپنے مہاجر بھائیوں کے لیے ایثار اور قربانی کی ایسی مثالیں قائم کیں جن کی نظیر خونی اور نسبی رشتوں میں ملنی مشکل تھی۔ لوگوں نے اپنی جائدادوں اور اپنے کاروبار میں اپنے مہاجر بھائیوں کو برابر کا شریک بنا دیا۔ بعضوں نے جن کے نکاح میں ایک سے زیادہ بیویاں تھیں اپنی ایک بیوی کو طلاق دے دی کہ ان کا مہاجر بھائی اس سے نکاح کرے۔ اس دینی مواخات کو ایک خاص زمانہ تک صرف اخلاقی ہی حیثیت حاصل نہیں رہی بلکہ اس کی ایک شرعی اور قانونی حیثیت بھی تھی تقسیم وراثت تک میں اس کا لحاظ ہوتا تھا۔

جو مسلمان کسی غلط ماحول میں اگرچہ وہ اس کا وطن ہی ہو، گھرا ہوا تھا اس کے لیے از روئے شرع یہ ضروری ہوا کہ وہ اس غلط ماحول سے نکل کر اس صالح معاشرہ میں شامل ہو جائے اور اگر وہ بغیر کسی شدید مجبوری کے اس سے گریز اختیار کرتا تو وہ منافق شمار ہوتا اور مسلمانوں پر سے اس کی نصرت و حمایت کی شرعی

اور قانونی ذمہ داری ساقط ہوجاتی۔ اس سلسلے کے بعض احکام ملاحظہ ہوں :۔

" تم اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی اپنا عزیز و قریب نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں اور جو ان کو عزیز و قریب بنائیں گے تو وہی لوگ ظالموں میں سے ہوں گے۔ کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں اور تمہارے خاندان اور وہ مال جو تم نے کمائے، وہ تجارت جس کی کساد بازاری کا تمہیں اندیشہ ہے اور وہ مکان جو تمہیں پسند ہیں اگر یہ تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر فرمائے اور اللہ نافرمانوں کو راہ یاب نہیں کرتا " (۲۳ - ۲۴ توبہ)

" جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی اور مال اور جان سے خدا کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے پناہ دی اور مدد کی یہی لوگ ایک دوسرے کے عزیز و رفیق ہیں اور جو لوگ ایمان تو لائے پر انھوں نے ہجرت نہیں کی تمہارے اوپر ان کی نصرت کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے جب تک وہ ہجرت نہ کریں۔"
(۷۲ - انفال)

جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص قوم کے لوگ اور آپ سے اخوت و رشتہ داری اور ہم وطنی کے تمام روابط رکھتے تھے اس نئے معاشرہ میں ان کے لیے بھی اس وقت تک کوئی جگہ نہیں تسلیم کی گئی جب تک وہ توبہ اور اصلاح کرکے اس معاشرہ کے بنیادی اصولوں کی پابندی کا اعلان نہ کریں۔ فرمایا :۔

" پس اگر وہ توبہ کریں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تب وہ تمہارے دینی بھائی ہیں" (۱۱ توبہ)

اس معاشرہ کے اندر ایمانی و اسلامی اقدار کو اتنی اہمیت حاصل ہوئی کہ اس میں سر گھس آنے والے کو، وہ کسی محرک کے تحت گھس آیا ہو، جگہ نہیں دی گئی بلکہ صرف انہی لوگوں کو جگہ دی گئی جن کو صرف ایمان و اسلام کی کشش نے دوسروں سے کٹنے اور اس کے اندر داخل ہونے پر آمادہ کیا ہو۔ قرآن کا یہ حکم ملاحظہ ہو :۔

" اے ایمان والو، اگر تمہارے پاس مومنہ عورتیں ہجرت کرکے آئیں تو ان کو جانچو۔ اللہ ان کے ایمان سے اچھی طرح باخبر ہے ..... پس اگر تم ان کو مومنہ پاؤ تو ان کو کفار کی طرف نہ لوٹاؤ ... اگر تم کافرہ

عورتوں کی عصمتوں کو اپنے قبضہ میں نہ رکھو"۔ (۱۰ ممتحنہ)

اس معاشرہ کے اندر ایک زرخرید لونڈی اگر وہ مسلمہ ہے اس شریف زادی پر ہزار درجہ ترجیح رکھتی تھی جو مشرکہ ہو۔

"اور مشرکہ عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں۔ ایک مومنہ لونڈی ایک مشرکہ شریف زادی سے کہیں بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں کتنی ہی بھلی لگے اور مشرکوں کے نکاح میں اپنی لڑکیاں نہ دو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں۔ ایک مومن غلام ایک آزاد مشرک سے کہیں بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں کتنا ہی بھلا لگے۔" (۲۲۱ بقرہ)

اس معاشرہ میں اخوت اور بھائی چارگی کی بنیاد خاندان یا وطن کے بجائے ایمان و اسلام کے رشتہ پر رکھی گئی۔

"اہل ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں" (۱۰ حجرات)

مسلمانوں کی تعریف یہ بیان کی گئی کہ وہ آپس میں رحم دل اور کریم النفس ہیں۔ برعکس اس کے اہل کفر کے لیے وہ سخت ہیں ان کو یہ موقع نہیں دیتے کہ وہ ان کے اندر دراندازی کر سکیں یا ان کو اپنے اغراض کے لیے استعمال کر سکیں۔

"محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار کے لیے سخت اور آپس میں مہربان ہیں"۔ (۲۹ فتح)

اخوت اور بھائی چارگی کی اس عمارت میں جتنی اینٹیں بھی لگائی گئیں، سب پر اسلام کا چھاپ تھا کسی غیر اسلامی روڑے یا پتھر کے لیے اس میں کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی۔

"مسلمان ایک مسلمان کے لیے ایسا ہی ہے جیسے ایک دیوار جس کی ہر اینٹ دوسری اینٹ کو تقویت پہنچاتی ہے"۔ (حدیث)

اس پورے اسلامی معاشرہ کو ایک جسم سے تشبیہہ دی گئی اور اس کے تشکیل کرنے والے اجزاء کو اس جسم کے اعضا کی حیثیت دی گئی جو اس جسم کے تمام احساسات میں برابر کے شریک ہیں۔

" مسلمانوں کی مثال آپس کی محبت، آپس کی دردمندی اور آپس کی ہمدردی میں ایسی ہے جیسے ایک جسم ہو کہ اس کے اگر کسی ایک عضو میں بھی کوئی تکلیف ہوتی ہے تو سارا جسم بے خوابی اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔" حدیث

اس معاشرہ اور اس قومیت نے جب ایک ریاست کی شکل اختیار کی تو ان لوگوں کے لیے جن کو اس کے اندر مکمل شہریت کے حقوق حاصل ہوئے مسلم کا لفظ استعمال ہوا۔ مسلم کا لفظ قرآن اور حدیث میں دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک خدا اور رسول کے کامل فرمانبردار کے معنی میں، دوسرے ایک اسلامی ریاست کے شہری کے لیے۔ عام اس سے کہ وہ صرف ظاہر میں اسلام کو مانتا ہے یا دل سے بھی اس کو مانتا ہے۔

" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے ہمارے طریقہ پر نماز پڑھی، ہمارے قبلہ کی طرف رخ کیا اور ہمارا ذبیحہ کھایا تو وہ مسلم (اسلامی ریاست کا شہری) ہے جس کے لیے اللہ اور اس کے رسول کا ذمہ قائم ہو چکا ہے تو اللہ کے ساتھ اس کی دی ہوئی ضمانت میں دغابازی نہ کرو"

(بخاری باب فضل استقبال القبلہ)

میمون بن یسار نے انس بن مالک سے پوچھا کہ اے ابوحمزہ آدمی کے جان و مال کو کیا چیز محترم بناتی ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ جو شخص لا الٰہ الا اللہ کی گواہی دے، ہمارے قبلہ کی طرف رُخ کرے، ہمارے طریقہ پر نماز پڑھے اور ہمارا ذبیحہ کھائے تو وہ مسلم (اسلامی ریاست کا شہری) ہے۔ اس کو مسلمانوں کے حقوق حاصل ہوں گے اور اس پر مسلمانوں کی سی ذمہ داریاں ہوں گی۔"

(بخاری باب مذکور)

اس اسلامی ریاست میں ایک مسلم کا تو یہ درجہ قرار پایا کہ اگر وہ حکومت کا صدر یا خلیفہ بن جائے تو خواہ کسی ذات برادری کسی نسل و نسب اور کسی ملک و وطن سے تعلق رکھتا ہو، معروف میں اس کی اطاعت واجب ہو گی۔ برعکس اس کے ایک غیر مسلم کو یہ حیثیت کسی حال میں بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ فرمایا:

" سنو اور مانو اگرچہ تمہارے اوپر ایک حبشی غلام بھی امیر بنا دیا جائے جس کا سر منقی جیسا ہو۔"

اسلام کے بنائے قومیت ہونے کا راز ان واضح اور قطعی دلائل کے بعد کسی شخص کے لیے یہ کہنے کی گنجائش تو باقی نہیں رہتی کہ اسلام میں قومیت کی بنیاد اسلام کے سوا کوئی اور چیز ہے۔ البتہ ایک خام ذہن میں یہ شبہ ممکن ہے پیدا ہو کہ یہ اسی طرح کا ایک مذہبی تعصب ہے جیسا کہ ہر مذہب کے ماننے والوں کے اندر ہوتا ہے کہ وہ کسی ایسے نظام اجتماعی کا تصور نہیں کر سکتے جس میں ان سے مختلف عقیدہ و مسلک رکھنے والے بھی مساوی حیثیت سے حصہ دار ہو سکیں۔ اس زمانہ میں چونکہ مذہب اور سیاست کی علیحدگی کا تصور ذہنوں پر پوری طرح مستولی ہو چکا ہے اس وجہ سے نہ صرف غیر مسلم بلکہ بہت سے مسلمان بھی اس غلط فہمی کا شکار ہیں۔ اس سبب سے ضروری ہے کہ ہم اس کے اصلی اسباب واضح کر دیں۔ ہمارے نزدیک اس کے خاص سبب تین ہیں۔

ایک سبب اس کا یہ ہے کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس میں دین اور دنیا یا مذہب اور سیاست کا الگ الگ کوئی تصور نہیں ہے۔ اس نے ہماری زندگی کے کسی گوشہ کو بھی خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی' آزاد نہیں چھوڑا ہے۔ اس نے جس طرح ہماری شخصی زندگی سے متعلق احکام دیئے ہیں اسی طرح ہماری اجتماعی اور سیاسی زندگی سے متعلق بھی احکام دیئے ہیں اور خاص شرائط کے پیدا ہو جانے کے بعد ان کی تعمیل کا بھی اسی طرح مطالبہ کیا ہے جس طرح شخصی زندگی سے متعلق احکام و قوانین کی تعمیل کا مطالبہ کیا ہے۔ ایک ایسا مذہب جس کا مزاج اس طرح کا ہمہ گیر اور کلیت پسند ہو اس کے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ قومیت کی اساس اپنے سوا کسی اور چیز کو بننے دے۔ اگر اجتماعی زندگی کی تشکیل کسی اور اصول پر ہو جائے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ قوم کا اجتماعی وجود ان احکام سے بغاوت کرے جو اسلام نے اجتماعی زندگی سے متعلق دیئے ہیں۔

اس کا دوسرا سبب یہ ہے کہ اسلام انسانوں اور انسانوں کے درمیان عقائد اور اصول کے اختلاف کے سوا ہر اختلاف کو غیر عقلی اور غیر فطری قرار دیتا ہے۔ وہ اس بات کو بالکل احمقانہ قرار دیتا ہے کہ ایک ہی آدم کی اولاد میں محض اس بنا پر فرق کیا جائے کہ ایک شخص کالا ہے، دوسرا گورا ہے۔ ایک شخص جرمن نسب سے تعلق رکھتا ہے دوسرا اطالوی نسب سے، ایک شخص ترکی بولتا ہے، دوسرا عربی بولتا ہے یا ایک شخص ایک خاص

سرزمین پر پیدا ہوا ہے اور دوسرا اس سرزمین پر نہیں پیدا ہوا ہے۔ آخر ایک ہی آدم وحوا کی اولاد ہیں۔ ایک ہی سے عقلی اور فطری مطالبات رکھنے والوں میں، ایک ہی سے میلانات وجذبات کے حاملوں میں اور ایک ہی سے انفرادی و اجتماعی تقاضے محسوس کرنے والوں میں محض ایسے ظواہر کی بنا پر کیوں فرق کیا جائے جو یا تو اتفاقی ہیں یا جن کا تعلق محض آب و ہوا سے ہے؟ انسان کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے اندر ایک عقلی ہستی رکھتا ہے اور فاطر کی طرف سے ایک خاص فطرت لے کر آیا ہے۔ اسلام کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ انسان کی عقل وفطرت کا بالکل صحیح مظہر ہے، اس وجہ سے جو لوگ اس کو مانتے ہیں ان کو تو وہ صراط مستقیم پر قرار دیتا ہے اور جو لوگ اس کو نہیں مانتے ان کو صراط مستقیم سے منحرف قرار دیتا ہے۔ ان کے متعلق اسلام کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اپنی عقل اور اپنی فطرت کے باغی اور اپنی خواہشات اور اپنے تعصبات کے پیرو ہیں اس وجہ سے اسلام ان تمام لوگوں کو تو بلا لحاظ نسل ونسب اور بلا امتیاز زبان و وطن باہم دگر جوڑتا ہے جو اسلام کو بحیثیت ایک نظام زندگی کے تسلیم کرتے ہیں اور ان لوگوں کو اس قومیت سے الگ رکھتا ہے جو اسلام کو نہیں مانتے۔ اسلام انسانوں اور انسانوں کے درمیان صرف اسی ایک تفریق کو صحیح اور عقلی قرار دیتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری بنیادوں پر وہ ہر جمع یا تفریق کو ناجائز قرار دیتا ہے۔

اس کا تیسرا سبب یہ ہے کہ قومیت کے جو معروف عوامل ہیں یعنی نسب یا وطن وغیرہ ان کے جو فطری حقوق ہیں وہ تو، جیسا کہ اوپر ہم بیان کر چکے ہیں، اسلام نے بہتر سے بہتر طریقے پر خود پورے کر دیئے ہیں۔ وہ سارے حقوق خود اسلام کا جزء بن چکے ہیں اور ایک سچے مسلمان کے لیے ان کا ادا کرنا اسی طرح ضروری ہے جس طرح روزے نماز کا پورا کرنا ضروری ہے۔ اب اس سے زیادہ جو لوگ ان چیزوں کو اہمیت دینا چاہتے ہیں یا دیتے ہیں وہ درحقیقت نسل یا وطن کے کسی فطری تقاضے کو نہیں پورا کر رہے ہیں بلکہ وہ ان کو وہ حقوق دینا چاہتے ہیں جو ان کے نہیں ہیں بلکہ خدا کے لیے خاص ہیں۔ ان چیزوں کو قومیت کی بنیاد تسلیم کر لینے سے نوع انسانی مختلف گروہوں اور ٹولیوں میں بلا کسی سبب معقول کے تقسیم ہو جاتی ہے، اس کے اندر تعصبات اور جھگڑے پیدا ہو جاتے ہیں، عداوتیں اور دشمنیاں ابھر آتی ہیں۔ ہر قوم کی قومیت

اور اس کی وطن دوستی کا یہ لازمی تقاضا بن جاتا ہے کہ وہ دوسری قوم سے لڑے۔ ہر نسل اس بات کو ایک فریضہ قومی سمجھتی ہے کہ وہ دوسری نسل پر اپنا تفوق جتائے۔ ہر زبان کے بولنے والے اپنا یہ پیدائشی حق جتاتے ہیں کہ ان کو ایک الگ قوم کی حیثیت سے منظم ہونے کا موقعہ ملے اور دریا اور پہاڑ کی ہر حد فاصل صرف زمین کے دو ٹکڑوں ہی کے درمیان حد فاصل نہیں رہتی ہے بلکہ وہ انسانوں اور انسانوں کے درمیان بھی ایک حد فاصل بن جاتی ہے۔ اسلام ایک امن اور سلامتی کا مذہب ہے، وہ انسانوں کو کاٹنے نہیں بلکہ جوڑنے آیا ہے۔ پھر وہ کس طرح یہ گوارا کر سکتا ہے کہ محض وہمی اور جذباتی تعصبات کی بنا پر دنیا میں یہ فساد فی الارض برپا رہے۔ اس وجہ سے وہ انسانیت کی تنظیم کے لیے نہایت اعلیٰ عقلی اور فطری اصول دیتا ہے اور لوگوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ نسل و نسب اور زبان اور وطن کی تمام تنگ نظریوں سے بالاتر ہو کر ان اصولوں پر مجتمع ہوں تاکہ خدا کی زمین پر بے شمار چھوٹی چھوٹی لڑنے والی ٹولیوں کی جگہ ایک ایسا گھرانا آباد ہو جائے جس میں خدا کی ساری مخلوق اور آدم کی پوری نسل سما سکے۔ صرف وہی اس سے الگ رہ جائیں جو نسلی اور وطنی تنگ نظریوں کے مریض اور اپنے مخصوص مفادات کی خاطر انسانیت کے وسیع مفادات کے دشمن ہوں۔

اسلامی قومیت اور غیر مسلم اب تفصیل سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہو گئی کہ غیر مسلم اسلامی قومیت کا کوئی جز نہیں بن سکتے اور ساتھ ہی یہ حقیقت بھی سامنے آگئی کہ اس تفریق کا باعث کوئی مذہبی تعصب نہیں ہے بلکہ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ وہ قومیت کے ان وسیع تصورات کو جو اسلام پیش کرتا ہے، اپنانے کے بجائے ایسے محدود تصورات پر اصرار کرتے ہیں جن سے امن و سلامتی کے بجائے زمین میں ہمیشہ فساد برپا رہے۔ اسلام ان کو نسل و نسب اور ملک و وطن کی تنگ نایوں سے نکال کر وحدت الٰہ، وحدت آدم اور وحدت فطرت انسانی کے عالمگیر اصولوں پر لانا چاہتا ہے لیکن جب وہ اپنی تنگ نظریوں کو چھوڑنا نہیں چاہتے تو وہ بجائے اس کے کہ ان کی خاطر اپنے آپ کو ان تنگ نظریوں میں گرفتار کرا دے ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر غیر مسلم اسلامی قومیت کا جز نہیں بن سکتے تو ایک اسلامی نظام میں ان کے لیے کونسی جگہ ہے۔ اس سوال کا جواب ہم نے نہایت تفصیل کے ساتھ اس سلسلہ کے ایک دوسرے مبحث میں دیا ہے[1]

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

---

[1] یہ مبحث ایک رسالہ کی شکل میں چھپ کر "غیر مسلموں کے حقوق" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

مقالات

مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی

خانہ کعبہ کی اہمیت کے اسباب

(۲)

۴ - خانہ کعبہ کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے محفوظ، پر امن اور ذریعۂ خیر و برکت بنایا ہے۔ اس گھر کی تعمیر ایک بے آب و گیاہ علاقہ میں ہوئی تھی جہاں سبزی و شادابی کا نشان تک نہ تھا اس لیے وہاں کسی آبادی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہر طرف ویرانہ ہی ویرانہ اور اجاڑ ہی اجاڑ تھا۔ مگر حضرت ابراہیمؑ کی نظر انتخاب اسی سرزمین پر پڑتی ہے جو مادی خیر و برکت سے محروم تھی، ان کے لیے یہ سوال بھی موجب پریشانی نہ ہوا کہ اس صحرا اور ویرانہ میں ان کے بال بچوں کی حفاظت کون کرے گا، انھیں صرف اللہ تعالیٰ کی رحمت و حفاظت کا بھروسہ تھا اس لیے اس سے دعا کی کہ اس زمین کو پر امن بنا دے اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کی اور اسے امن و سکون کا گہوارہ اور ہر قسم کی آسائش و برکت کا ذریعہ بنا دیا اور ہر طرف خوشحالی اور فارغ البالی کا دور دورہ کر دیا۔ حضرت ابراہیمؑ کی دعا اور آرزو صرف اس قدر تھی کہ اس گھر کی برکت اور اس کا امن صرف مومنین کے لیے مخصوص ہو لیکن اللہ تعالیٰ نے اس گھر کی حرمت و عزت کے خیال سے یہ بات پسند نہ کی کہ ابراہیمؑ کی کافر اولاد بھی اپنی ناشکری کی سزا اس مامون و مصئون سرزمین میں پائے چنانچہ فرمایا :-

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ — اور جب ابراہیم نے کہا خداوندا اس شہر کو پر امن بنا

اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَھْلَہٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْھُمْ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ قَالَ وَمَنْ کَفَرَ فَاُمَتِّعُہٗ قَلِیْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّہٗٓ اِلٰی عَذَابِ النَّارِ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ (بقرہ ۱۲۶)

اور اس کے باشندوں میں جو اللہ اور آخرت پر ایمان لائیں انھیں پھلوں کا رزق عطا کر! خداوند نے کہا اور جو کفر و انکار کریں گے ان کو بھی کچھ مدت تک (دنیا کی زندگی میں) نفع دوں گا پھر ان کو آگ کے عذاب کی طرف ڈھکیل دوں گا اور وہ بڑا برا ٹھکانا ہے۔

غور کرو اللہ نے کس طرح اس متبرک سرزمین کی راحت و نعمت کو کافر و مومن سب کے لیے عام کیا ہے۔ اس علاقہ میں جہاں آبادی کا نام و نشان تک نہ تھا ہر قسم کے خطرات ہو سکتے تھے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے سراپا امن و برکت بنا دیا اور وہاں کسی قسم کا کوئی خطرہ باقی نہ رہا۔ اس کے اردگرد چاروں طرف لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم تھا، دن دہاڑے قتل و غارت گری اور چوری اور ڈاکہ کے واقعات ہوتے رہتے تھے لیکن خاص اس شہر میں ہر طرح کا امن و اطمینان تھا۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّیُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِھِمْ (عنکبوت ۶۷)

کیا یہ لوگ (کفار قریش) خدا کا احسان نہیں دیکھتے کہ ہم نے ان کے لیے پرامن حرم بنایا جس کی وجہ سے یہ لوگ ہر قسم کے خطرات سے محفوظ ہیں حالانکہ اور دوسرے لوگ ان کے آس پاس کے اچک لیے جاتے ہیں۔

دوسری جگہ ان لوگوں کے ایمان اور ہدایت قرآنی نہ قبول کرنے کے شبہ اور خطرہ کا ذکر کرکے اس کا جواب دیا گیا ہے:

وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْھُدٰی مَعَکَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا اَوَلَمْ نُمَکِّنْ لَّھُمْ حَرَمًا اٰمِنًا یُّجْبٰٓی اِلَیْہِ ثَمَرٰتُ کُلِّ شَیْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰکِنَّ اَکْثَرَھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (قصص ۵۷)

اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہم آپ کی ہدایت قبول کرلیں گے تو اپنی سرزمین سے اچک لیے جائیں گے، کیا ہم نے ان کے لیے محفوظ حرم نہیں بنایا جہاں ہر قسم کے پھل ہماری طرف سے روزی بن کر ان کو ملتے ہیں لیکن ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے۔

"حرم" کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ سرزمین اس قدر محترم اور باعزت ہے کہ وہاں کسی کے جان، مال،

آبرو کا کوئی خطرہ نہیں گویا وہ علاقہ دعاء ابراہیمی کے باعث سراپا امن، سراپا خیر و برکت اور ہر طرح کی مادی فارغ البالی اور خوش حالی کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت اور نگرانی کا ذمہ لیا اور صاف صاف فرمایا کہ جو لوگ اس گھر کی حرمت و عزت کو بٹہ لگائیں گے اور اس میں شرک و الحاد کے مرتکب ہوں گے انھیں سخت سزا دوں گا (ومن یرد فیہ بالحاد بظلم نذقہ من عذاب الیم) چنانچہ جب ابرہہ کا عظیم الشان لشکر اسے ڈھانے کے لیے بڑھا تو اللہ تعالیٰ نے اس گھر کی حفاظت کی اور اس کے لشکر کو تباہ و غارت اور اس کی تمام اسکیموں اور مخفی تدبیروں کو باطل کر دیا۔ سورۂ فیل میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ سے صرف اس قدر دعا کی تھی کہ اس گھر کی خیر و برکت اور امن و رحمت کو مومنین کے لیے مخصوص کر دیا جائے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس میں وسعت دی اور کہا کہ جو لوگ کفر کریں گے وہ بھی اس شہر کے امن و برکت سے دنیا کی زندگی میں فائدہ اٹھائیں گے۔

اس کے مقابلہ میں بیت المقدس کا حال دیکھیے کہ حضرت سلیمانؑ سے کیا کہا جاتا ہے، سلاطین (ب ۹ : ۱ - ۹) میں اس طرح مذکور ہے :-

"اور ایسا ہوا کہ جب سلیمان خداوند کا گھر اور بادشاہ کا قصر بنا چکا اور سلیمان کی ساری تمنا جو اس کے دل میں تھی پوری ہو چکی تو خداوند سلیمان کو دوسری بار دکھائی دیا جس طرح جبعون میں دکھائی دیا تھا اور خداوند نے اس سے کہا کہ میں نے تیری دعا اور مناجات جو تونے میرے آگے کی سنی ہے اور اس گھر کو جو تونے بنایا کہ میرا نام ابد تک اس میں رہے مقدس کیا، سو میری نگاہ اور میرا دل سدا اسی پر رہے گا اور اگر تو میرے حضور ایسی چال چلے گا جیسے تیرا باپ داؤد دل کی راستی اور صداقت سے چلا اور ان سب حکموں پر جو میں نے تجھ سے کیے عمل کرے گا اور میری شریعتوں اور میری عدالتوں کو حفظ کرے گا تو میں تیری سلطنت کا تخت اسرائیل میں ہمیشہ قائم رکھوں گا جیسے میں نے تیرے باپ داؤد سے وعدہ کیا اور کہا کہ تیرے یہاں مرد کی کمی نہ ہوگی جو اسرائیل کے تخت پر بیٹھے پر اگر تم یا تمہاری اولاد میری پیروی سے کسی طرح برگشتہ ہوگے اور تم میری شریعتوں اور عدالتوں کو جو میں نے تمہیں بتائیں حفظ نہ کروگے

اور اجنبی معبودوں کو عبادت کرنے لگ جاؤ گے اور انھیں سجدہ کروگے تو میں اسرائیل کو اس سرزمین سے جو میں نے انھیں دی ہے فنا کر دوں گا اور اس گھر کو جسے میں نے اپنے نام کے لیے مقدس کیا ہے اپنی نظر سے گرادوں گا اور اسرائیل تمام جہاں میں ضرب المثل اور انگشت نما ہوگا اور اس بلند گھر کے برابر سے جو کوئی گذرے گا حیران ہوگا اور سیٹی بجائے گا اور وہ کہیں گے خداوند نے اس سرزمین اور اس گھر سے ایسا کیوں کیا تب وہ جواب دیں گے یہ اس لیے ہوا کہ انھوں نے خداوند اپنے خدا کو جوان کے باپ دادوں کو زمین مصر سے نکال لایا ترک کیا اور اجنبی معبودوں کو اختیار کیا اور انھیں سجدہ کیا اور ان کی بندگی کی اس لیے خداوند نے ان پر یہ سب بلا نازل کی "

اس تقابل سے اہل نظر خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ خانہ کعبہ کی خصوصیت و امتیاز میں مسجد یروشلم کہاں تک شریک و سہیم ہے۔

حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کو شور اور غیر آباد علاقہ میں لبسایا تھا جہاں کھیتی باڑی کا نام بھی نہ تھا اس لیے ان کی دعا کا ایک جزء یہ بھی تھا کہ " وارزق اھلہ من الثمرات ، اس کو بھی اللہ تعالیٰ نے شرف قبولیت بخشا اور مکہ میں ہر قسم کی سبزیاں ، ترکاریاں اور تازہ پھل اور میوے مہیا کر دیئے اور وہاں کے لوگوں میں تجارت اور سوداگری کا شوق وجذبہ پیدا کر دیا۔ عرب کی قدیم تاریخ میں بنی اسمٰعیل تجارت پیشہ کی حیثیت سے نظر آتے ہیں ، یہ لوگ ، یمن ، حبشہ ، شام ، مصر اور روم وغیرہ ملکوں کو سفر و تجارت کے لیے جاتے اور مال و دولت کماتے۔ ان کے رزق کا دوسرا وسیلہ اللہ تعالیٰ نے یہ مہیا کر دیا کہ مکہ کو تجارتی منڈی بنادیا ، موسم حج میں حجاج اپنے کھانے پینے اور دوسری ضرورت کی چیزیں یہاں کے لوگوں سے خریدتے ، اونٹ اور دنبے یہاں کی خاص چیزیں ہیں حجاج قربانی کے لیے خریدتے جس سے مقامی باشندوں کو بڑا نفع ہوا اور حج کے زمانہ میں وہ ان حاجیوں کے اجتماع سے اس قدر کما لیتے کہ سال بھر کے لیے کافی ہوتا۔

غرض اس گھر کی بدولت اللہ تعالیٰ نے اس سرزمین کو پرامن اور مادی و روحانی ہر دو طرح کی نعمتوں کا گہوارہ اور سرچشمہ بنادیا تھا اسی لیے سورۂ آل عمران میں اس کی خصوصیت " مبارکاً وھدی للعالمین اور ومن دخلہ کان امنا " بھی بیان ہوئی ہے۔

۵ - خانۂ کعبہ کی عظمت و برتری کی پانچویں دلیل اس کا قبلہ ہونا ہے۔ اگرچہ یہ امر محتاج تشریح ہے کہ اسے قبلہ کیوں بنایا گیا لیکن یہاں اس کی تفصیل و تشریح کی گنجائش نہیں ہے۔ آگے اس کی طرف بعض اشارات آئیں گے اور خانۂ کعبہ کی جو خصوصیات ہم بیان کر رہے ہیں ان سے اس سوال کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑے گی۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے سب بالاتفاق اس کو اپنا قبلہ مانتے ہیں اس کے ثبوت کے لیے کسی وضاحت اور تفصیل کی ضرورت نہیں ہے سورۂ بقرہ میں کعبہ کے قبلہ ہونے کی پوری تفصیل بیان ہوئی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابتدا میں خانۂ کعبہ کی ہی طرف رُخ کرکے نماز پڑھتے تھے لیکن قرآن جب نازل ہونا شروع ہوا تو چونکہ وہ توراۃ اور انجیل کی پیشین گوئیوں کے عین مطابق تھا اس لیے جن باتوں میں ابھی تک براہ راست قرآن نے کوئی واضح حکم نہیں دیا تھا ان میں آپ یہود کے شرائع پر عمل کرتے۔ اسی لیے آپ نے ان کے قبلہ بیت المقدس کو اپنا قبلہ بنالیا۔ مگر جب دین قیم کی تفصیلات آپ کو بتلادی گئیں اور اصل قبلہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دے دیا گیا تو آپ نے بیت اللہ کی طرف رُخ کرنا شروع کردیا۔

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ اصل قبلہ اور مرکز ابراہیمی کعبہ ہی ہے اور اسی کی طرف تمام ذریت ابراہیم کو (بشمول یہود و نصاریٰ) رخ کرنے کا حکم دیا گیا تھا، قرآن اور توراۃ دونوں سے اس کی تائید و توثیق ہوتی ہے۔

قرآن مجید نے سورۂ بقرہ میں یہود کو رسالت محمدی پر ایمان لانے کی پرزور دعوت دی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ یہ نبی دعائے ابراہیمی کی جملہ خصوصیات[1] اور تمہاری کتابوں کی پیشین گوئیوں کے ٹھیک مطابق[2] آگئے ہیں۔ ان کا دین یہودیت، نصرانیت اور شرک کے برعکس دین فطرت اور ملت ابراہیمی کے عین مطابق ہے اور یہ حضرت ابراہیمؑ کے غیر محرف اور اصلی دین و شریعت کی تلقین کر رہے ہیں اور اسی سلسلہ میں ملت ابراہیمی کے اصلی قبلہ کی نشان دہی بھی کر رہے ہیں۔

---

[1] ربنا وابعث فیھم رسولا منھم یتلوا علیھم آیاتک ویعلمھم الکتاب والحکمۃ ویزکیھم انک انت العزیز الحکیم (بقرہ)
[2] مصدق لما معھم

اس طرح اس سورہ میں یہود کی تحریف و تلبیس اور ان کی شرارتوں اور سازشوں کا پردہ چاک کرکے دین ابراہیم کو اس کی اصلی مکمل اور صحیح شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اسی لیے قبلہ کو بھی اس کی صحیح شکل و نوعیت اور دین ابراہیمی کے مطابق واضح کر دیا گیا ہے۔ اب ایک ترتیب سے قبلہ کی آیتوں پر غور کیجئے، تو حسب ذیل نتائج سامنے آئیں گے۔ سب سے پہلے اصولی طور پر ایک تمہید بیان کی گئی ہے تاکہ تحویل قبلہ کا حکم آنے سے پہلے لوگوں کا ذہن اس کے متعلق صاف رہے اور وہ تبدیلی قبلہ کی وجہ سے کسی اشتباہ اور تردد میں نہ پڑیں چنانچہ کہا گیا کہ مشرق و مغرب اور پوری کائنات خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے وہ ہر جگہ موجود ہے جدھر چاہے قبلہ بنائے۔ اس کا کسی خاص سمت سے تعلق نہیں ہے یہ یہود و نصاریٰ کی غلطی ہے کہ ایک نے مشرق کو اور دوسرے نے مغرب کو قبلہ بنا لیا حالانکہ اگر کوئی مرکز توجہ اور قبلہ بن سکتا ہے تو وہ کعبہ ہے کیونکہ دین حنیفی اور ملت ابراہیمی کا اصل مرکز وہی ہے اس لیے عبادت و تقدس کے لحاظ سے اس سے بڑھ کر کوئی مقام قبلہ کے لیے موزوں نہیں ہو سکتا اور خدا علم والا ہے اس لیے جانتا ہے کہ قبلہ کے لیے کون سی جگہ موزوں و مناسب ہے۔

دوسری بات یہ بتائی گئی کہ جو لوگ کعبہ کو قبلہ نہیں مانتے وہ سخت سفاہت اور حماقت میں مبتلا ہیں اور ملت ابراہیمی سے بیزار ہیں اور ان کی سفاہت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ملت ابراہیمی کے مطابق قبلہ بنائے جانے پر معترض ہو رہے ہیں۔

تیسری بات یہ کہ یہود و نصاریٰ صراط مستقیم اور دین صحیح سے منحرف ہو گئے ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ اصلی اور قبلہ وسط کو ترک کر بیٹھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ بڑا فضل ہے کہ اس نے بنی اسماعیل کو اصل قبلہ کی جانب رخ کرنے کی توفیق و ہدایت بخشی۔

تحویل قبلہ سے پہلے خود آنحضرت صلعم کو قبلہ ابراہیمی کا انتظار و اشتیاق تھا اس لیے اللہ تعالےٰ نے قبلہ بدل کر آپ کو آپکے مرغوب اور پسندیدہ قبلہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا۔

ایک بات یہ بھی واضح کی گئی ہے کہ بنی اسرائیل بھی بیت اللہ کے اصل اور ابراہیمی قبلہ ہونے کو جانتے اور سمجھتے تھے لیکن اپنی بدنیتی اور کجی کی وجہ سے اس پر پردہ ڈال رہے تھے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ ستم بھی

کررہے تھے کہ اسی بنیاد پر انھوں نے پیغمبر آخر الزماں کی مخالفت کرنا شروع کردیا تھا۔

ایک شبہ یہ پیدا ہورہا تھا کہ اگر اصل قبلہ بیت اللہ ہی تھا تو روز اول ہی سے اس کی طرف رُخ کرنے کا حکم کیوں نہیں دیا گیا تاکہ بعد میں یہ نوبت نہ آتی کہ لوگ اسی بنیاد پر ایمان و اسلام سے منحرف ہونے لگتے۔ اس شبہ کا ازالہ اس طرح کیا گیا کہ دراصل تحویل قبلہ کا منشا ء ابتلا و آزمائش اور اس بات کو نمایاں کردینا ہے کہ کس کے دل میں واقعی رسول کی محبت و اتباع کی اصل روح پیدا ہوئی تھی اور کس کے اندر نہیں تو تبدیل قبلہ کی وجہ سے جو لوگ رسول کی مخالفت اور ایمان کو ترک کررہے ہیں وہ فی الواقع ایمان کی اصل لذت وحلاوت سے آشنا ہی نہیں ہوئے تھے اور ان کا مقصد ہی یہ تھا کہ ایک نہ ایک دن اس رشتہ کو ختم کرکے دوسروں کو بھی اس سے بدظنی اور انحراف پر آمادہ کریں گے چنانچہ انھوں نے اس موقعہ کو حیلہ اور بہانہ بناکر اپنی دیرینہ آرزو پوری کی ہے اس لیے تم لوگ اس طرح کے شبہات میں نہ پڑو، اللہ تعالیٰ بڑا ہی مہربان اور شفیق ہے وہ کسی کے ایمان کو برباد اور ضائع نہیں کرنا چاہتا آخری بات یہ بتائی گئی ہے کہ تبدیل قبلہ سے اتمام حجت اور تکمیل نعمت مقصود ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہودیت اور نصرانیت دونوں دین ابراہیمی سے انحراف ہیں۔ نبی اکرمؐ کی دعوت اس کی اصلی، صحیح اور مکمل شکل ہے اس لیے آپ کو اسی کے جملہ احکام و شرائع کی تلقین اور اس پر مکمل طور سے عمل پیرا ہونے کی تاکید کی جارہی ہے تاکہ اب بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل دونوں پر حجت تمام ہوجائے اس لیے کہ مشرکین عرب اسی گھر کو قبلہ مانتے تھے اور دین صحیح کی جو کچھ تھوڑی بہت میراث ان کے پاس تھی اس میں یہ بھی تھا کہ ابراہیمی قبلہ یہی ہے۔

تکمیل نعمت کا مطلب یہ ہے کہ بیت اللہ جب مسلمانوں کی تولیت اور انتظام میں آئے گا تو وہ مکمل دین ابراہیم کے متبع اور علمبردار سمجھے جائیں گے اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ دینی و دنیاوی ہر طرح کی نوازشیں اور انعامات کرے گا۔

گو یہ بات پہلے واضح کی جاچکی ہے کہ سورہ بقرہ میں خانۂ کعبہ کے قبلہ اور مرکز ہونے کا صاف صاف ذکر ہے اور یہود بھی اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر تھے۔ لیکن مزید وضاحت کے لیے ان آیات کو نقل کرکے ان کے خاص گوشوں اور اہم پہلوؤں کی طرف اشارات کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے :-

قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاۗءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىھَا ۠ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْھَكُمْ شَطْرَهٗ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ .... اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰھُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَاۗءَھُمْ ۭ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْھُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ، اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۔ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ

(بقرہ ۱۴۴ ، ۱۴۶ ، ۱۴۷ ، ۱۴۹)

(اے پیغمبر) ہم تمہارے چہرے کو آسمان کی طرف اٹھا ہوا دیکھتے تھے (اس لیے) ہم نے فیصلہ کیا کہ تم کو اس قبلہ کی طرف پھیر دیں جسے تم پسند کرتے ہو پس اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف کر لو اور جہاں بھی رہو تو اسی کی طرف اپنا رخ کرو۔ بلاشبہ جن لوگوں کو کتاب دی گئی وہ جانتے ہیں کہ قرآن حق اور ان کے رب کی طرف سے ہے اور اللہ ان کے اعمال سے بے خبر نہیں ... ہم نے جن لوگوں کو کتاب عطا کی ہے وہ قرآن کو اپنے بیٹوں کی طرح پہچانتے ہیں لیکن ان میں ایک گروہ ایسا ہے جو دیدہ و دانستہ حق کو چھپاتا ہے، حق تو تیرے رب کے پاس سے آیا ہے پس تو شک و شبہ کرنے والوں میں نہ ہو... اور جہاں کہیں بھی ہو مسجد حرام کی طرف اپنا رخ کرو بیشک یہی صحیح اور خدا کی طرف سے حق ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں ہے۔

(باقی)

بقیہ اسلامی قومیت کے عوامل

وہاں ہم نے نہایت وضاحت کے ساتھ بتایا ہے کہ غیر مسلم اگرچہ اسلامی قومیت کا کوئی جز نہیں ہیں لیکن اسلامی نظام میں ان کے لیے نہایت باعزت جگہ محفوظ کر دی گئی ہے ۔

مکتبہ میثاق نے ہر قسم کی دینی اور علمی کتابیں مہیا کرنے کا انتظام کیا ہے کتابیں منگانے کے لیے رقوم پیشگی بھیجی جائیں یا کتابیں بذریعہ وی پی طلب کی جائیں ۔ مینیجر مکتبہ میثاق لاہور

مُراسلہ و مُذاکرہ

امین احسن اصلاحی

• اہلِ سُنّت کے فرقوں میں رَواداری

سوال : میرے دل میں ایک خلش ہے، امید ہے آپ اس کو دور فرمادیں گے۔
بندہ مسلک حنفیہ پر تھا، لبعد ازاں بندہ نے موطا امام مالک کا مطالعہ کیا تو رفع یدین بھی کرنے لگا اور دیگر امور بھی۔ کوئی مسئلہ دیکھنا ہو تو موطا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ میں دیکھ لیتا ہوں
دیگر بات یہ ہے کہ اگر نماز باجماعت حنفیوں کے ساتھ پڑھوں تو رفع یدین نہیں کرتا اگر اہل حدیث یا رفع یدین کرنے والوں کے ساتھ پڑھوں تو رفع یدین کر لیتا ہوں۔ میں دونوں فعل کو نبی اکرم صلعم کا فعل سمجھتا ہوں اور نماز تراویح کے متعلق بھی یہی رویہ ہے، ۸ رکعت پڑھتا ہوں، لیکن بیس بھی پڑھ لیتا ہوں۔ جب کہ حنفیوں کے ساتھ مل کر پڑھوں۔
یہ اس واسطے کرتا ہوں کہ اہل سنت والجماعت کے فرقوں میں بغض اور عناد کا جو روگ لگا ہوا ہے اس کو اپنے اندر پیدا کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ بغض وعناد سے پاک رکھے۔
خلش یہ ہے کہ کیا میرا یہ فعل منافقت پر مبنی تو نہیں ہے۔ یا دوغلہ پن تو نہیں ہے کہ جس کے ساتھ ہوا، اُس جیسا عمل کیا۔ مہربانی فرما کر میری اس خلش کو دُور فرما دیں۔

جواب : اگر آپ کا یہ طرز عمل اس مقصد پر مبنی ہے کہ اہل سنت والجماعت کے مختلف فرقوں میں رواداری پیدا ہو اور جو اختلاف ونفاق بدقسمتی سے اس وقت ان کے درمیان پھوٹ پڑا ہے وہ

دور ہو تو اس کو منافقت کون قرار دے سکتا ہے؟ اگر یہ چیز منافقت ہے تو پھر ایمان و اسلام کس چیز کو کہیں گے؟ اللہ تعالیٰ آپ کے اس جذبہ میں برکت عطا فرمائے اور دوسروں کو بھی توفیق دے کہ وہ تعصب و تنگ نظری سے بچیں اور اہلِ سنت کے درمیان اتحاد و اتفاق اور رواداری پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ جو چیز منافقت ہے اور جس سے اہلِ علم نے روکا ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کسی باطل کے ساتھ محض اپنی ذاتی مصلحتوں کی خاطر رواداری برتے۔ یا ائمہ کے مختلف اقوال میں سے صرف رخصتوں اور اپنی حسبِ خواہش باتوں کی تلاش میں رہے اور جب جو مسلک اس کی خواہش کے مطابق نظر آجائے اس کے پیرو ہونے کا مدعی بن بیٹھے۔ یہ چیز بلاشبہ غلط ہے اور یہ بعض صورتوں میں منافقت بن جاتی ہے اور بعض حالتوں میں اتباعِ ہویٰ۔ اس وجہ سے اس سے احتراز ضروری ہے۔

جہاں تک اہلِ سنت کے مختلف مسالک کا تعلق ہے ان میں جو اختلاف ہے وہ حق و باطل کا اختلاف نہیں ہے بلکہ محض اجتہادِ رائے کا اختلاف ہے۔ ہم جس امر میں جس مسلک کو دلائل کے لحاظ سے قوی پاتے ہیں اس کو اختیار کرتے ہیں لیکن دوسرے مسلک کو باطل نہیں قرار دیتے، بلکہ اپنے اختیار کردہ مسلک کے مقابل میں اس کو مرجوح سمجھتے ہیں، یعنی یہ مانتے ہیں کہ صحت کا امکان اس کے اندر بھی موجود ہے۔ اس وجہ سے اہلِ سنت کے مختلف فرقوں میں جو اختلاف ہے اس کو اختلافِ رائے سے آگے بڑھا کر حق اور باطل کا اختلاف بنا دینا محض دین سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ میں نے اپنی کتاب "فقہی اختلافات کا حل" میں ائمہ کی ایک دوسرے کے ساتھ رواداری پر بھی بحث کی ہے۔ اس کی چند سطریں یہاں نقل کرتا ہوں۔

> "چونکہ یہ حضرات (یعنی ہمارے ائمہ) حق کو اپنے ہی اقوال کے اندر محدود نہیں سمجھتے تھے اس وجہ سے یہ اپنے اپنے مسلک پر قائم رہتے ہوئے دوسروں کو بھی عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور ان کے مسلک و مذہب کی قدر کرتے تھے۔ آج کتنے حنفی اور کتنے اہلِ حدیث ہیں جو ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں سمجھتے لیکن ہمارے بزرگ ائمہ کا طریقہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے اصحاب برابر مدینہ کے مالکی ائمہ کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے حالانکہ یہ لوگ بسم اللہ نہ تو سراً پڑھتے تھے نہ جہراً۔ رشید نے امام مالکؒ کے فتوے پر

فصد کے بعد وضو کیے بغیر نماز پڑھائی، قاضی ابو یوسف رح نے ان کے پیچھے نماز پڑھ لی اور دہرائی نہیں۔ امام احمد بن حنبل رح نکسیر ٹوٹنے اور جسم سے خون نکلوانے کی صورت میں وضو کے قائل تھے۔ ان سے سوال کیا گیا کہ اگر امام کے جسم سے خون نکل آئے اور وہ وضو نہ کرے تو کیا آپ اس کے پیچھے نماز پڑھیں گے؟ انھوں نے فرمایا، بھلا میں امام مالک رح اور سعید بن مسیب جیسے لوگوں کے پیچھے نماز پڑھنے سے کس طرح انکار کرسکتا ہوں۔ قاضی ابو یوسف رح اور امام محمد رح کے متعلق روایت ہے کہ یہ لوگ عیدین میں تکبیر ابن عباس رض کے مذہب کے مطابق کہتے تھے اس لیے کہ ہارون الرشید کو اپنے جد امجد کا طریقہ تکبیر زیادہ پسند تھا اور وہ ان بزرگوں کے پیچھے نماز پڑھا کرتا تھا۔ امام شافعی رح نے ایک مرتبہ صبح کی نماز امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مقبرہ کے قریب پڑھی، اس دن انھوں نے امام صاحب رح کے احترام میں دعائے قنوت نہیں پڑھی اور فرمایا کہ ہم کبھی کبھی اہل عراق کے مذہب کو بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ قاضی ابو یوسف رح کے متعلق روایت ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے حمام میں غسل کر کے جمعہ کی نماز پڑھائی، جب لوگ متفرق ہو چکے تو پتہ لگا کہ حمام کے کنوئیں میں چوہیا مری ہے۔ ان سے ذکر کیا گیا تو فرمایا کچھ مضائقہ نہیں آج ہمارا عمل اہل مدینہ کے مذہب پر ہوگا۔ اذا بلغ الماء قلتین لم یحمل خبثاً (ص ۸۳-۸۴)

اس پورے اقتباس کو ملاحظہ فرمائیے تو معلوم ہوگا کہ آپ کے طرز عمل کے لیے ہمارے ائمہ کے طرز عمل میں مثال موجود ہے ان معاملات میں میرا اپنا طریقہ آپ کے طریقہ سے کسی قدر مختلف ہے۔ میں حتی الوسع عمل تو ہر موقع پر اسی مسلک پر کرتا ہوں جس کو میں اپنے علم کی حد تک قوی سمجھتا ہوں لیکن دوسروں کا تخطیہ نہیں کرتا۔ میرے دل میں چاروں ائمہ اور ان کے مسالک و مذاہب کے لیے یکساں احترام موجود ہے اور یہی احترام میں اپنے دل میں حضرات اہل حدیث اور مسلک اہل حدیث کے لیے رکھتا ہوں۔

کیا موجودہ زمانہ میں اسلامی نظام کا امکان ہے؟

سوال :۔ تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہی پتہ چلتا ہے کہ چند سالہ اسلامی دور حکومت کے علاوہ آج تک مسلمانوں کی کوئی ایسی ریاست قائم نہ ہو سکی جس کی بنیادیں قرآن و سنت پر ہوں۔ اور اب جب کہ پوری قوم روز بروز ترقی کی بجائے روبہ تنزل ہے کیا امید کی جاسکتی ہے کہ

ایسے نازک ترین حالات میں یہ قوم متحد ہو سکے اور قانون اسلامی کے نفاذ کی کوئی عملی صورت پیدا ہو؟ اور کیا یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ یہ گندا معاشرہ صالح سوسائٹی میں تبدیل ہو جائے گا؟ اگر نہیں تو کوشش برائے کوشش کے سوا حاصل کچھ نہیں۔

جو نسلیں پیدا ہو رہی ہیں یا آئندہ ہوں گی۔ بظاہر تو یہی نظر آتا ہے کہ دینی لحاظ سے وہ پہلوں سے کم درجہ کے ہی مالک ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے دین سے لگاؤ ہی نہیں یہاں تک کہ علماء کی اولادیں بھی کالجوں ہی کی نذر ہو گئی ہیں۔ ان حالات کو سامنے رکھتے ہوئے ہم کب امید کر سکتے ہیں کہ اسلامی انقلاب برپا کر ڈالیں گے۔ میرا تو خیال ہے کہ یہ سارا وعظ رسالوں، کتابوں اور بیانات تک ہی منحصر ہے تو یہ لمبی امیدیں باندھ رکھنا فضول ہی نظر آتا ہے۔

جواب: نظام خواہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی، کوئی نظام بھی خود کار نہیں ہوا کرتا کہ وہ دنیا میں از خود قائم ہو جائے۔ اس کے قائم کرنے کے لیے بہرحال اس کے چاہنے والوں کو جدوجہد کرنی پڑتی ہے، جب وہ اپنی جدوجہد سے اس کے قیام کے تمام شرائط پورے کر دیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تو وہ نظام دنیا میں برپا ہو جاتا ہے۔

اسلامی نظام کے قیام کے امکانات پر بحث کرتے ہوئے دو باتوں پر غور کرنا چاہیے۔ ایک یہ کہ یہ نظام کبھی دنیا میں قائم ہو سکا ہے یا نہیں، دوسری یہ کہ جب قائم ہوا تو یہ دنیا کے لیے موجب خیر و برکت ہوا یا نہیں۔ آپ جب ان دونوں سوالوں پر غور کریں گے تو آپ تسلیم کریں گے کہ تاریخ ان دونوں سوالوں کے جواب اثبات میں دیتی ہے بلکہ تاریخ کی شہادت تو یہ ہے کہ دنیا کے لیے خیر و برکت ہونے کے اعتبار سے اس سے بہتر نظام اس کے بعد کوئی دوسرا قائم نہ ہو سکا۔ اس حقیقت کا اعتراف صرف دوستوں ہی کو نہیں بلکہ ہمارے ان مخالفوں کو بھی ہے جن میں انصاف اور سچائی کا کوئی شائبہ ہے۔

جب یہ نظام تجربہ کی کسوٹی پر بھی پورا اتر چکا ہے اور عملاً موجب خیر و برکت بھی ثابت ہو چکا ہے تو سوال یہ ہے کہ اس زمانہ میں یہ کیوں نہیں قائم ہو سکتا؟ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ کا عقلی معیار اتنا بلند ہو چکا ہے کہ اسلام اتنا بلند نہیں ہو سکتا یا دنیا کا اخلاقی اور عقلی معیار اتنا پست ہو چکا ہے کہ اس دنیا کو

اسلام کی سطح تک اٹھایا نہیں جاسکتا ؟ یا اب کوئی دوسرا نظام اسلام کے نظام سے بہتر وجود میں آچکا ہے جس کے وجود میں آجانے کے بعد اسلامی نظام دنیا کے لیے ضروری نہیں رہا۔ آپ کے سوال سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی نگاہ میں دوسرا پہلو ہے، آپ سمجھتے ہیں کہ اب مسلمانوں کا اخلاقی زوال اس حد کو پہنچ چکا ہے کہ اب ان کے ہاتھوں اسلامی نظام کی توقع بالکل فضول ہے۔ آپ سے ذرا مختلف نقطہ نظر رکھنے والا ایک اور گروہ بھی موجود ہے (جس میں نام نہاد مسلمانوں کا ایک طبقہ بھی شامل ہے) جو سمجھتا ہے کہ اب دنیا ذہنی اور عقلی اعتبار سے اس قدر آگے جاچکی ہے کہ اب وہ اپنے لیے خود ہی اپنی ضرورت کے لحاظ سے نظام ایجاد کرے گی، پرانے نظاموں میں سے کوئی نظام بھی اس کے لیے موزوں نہیں رہا اگرچہ وہ اسلام ہی ہو۔

میں جب ان دونوں نقطہائے نظر پر غور کرتا ہوں تو مجھے یہ دونوں ہی غلط فہمی پر مبنی معلوم ہوتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ موجودہ زمانہ میں دوسروں کا تو درکنار خود اسلام کے علمبرداروں کا اخلاقی زوال اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ اس کو دیکھ کر دل بیٹھ جاتا ہے لیکن کیا وہ معاشرہ ہمارے معاشرہ سے بہتر تھا جس میں اسلامی دعوت کا آغاز ہوا ؟ ہر شخص جانتا ہے کہ وہ معاشرہ ہمارے معاشرہ سے بدرجہا پست تھا لیکن اللہ کے رسول اور اس کے ساتھیوں نے اسی کے اندر کام کیا اور اس کو بدل کر رکھ دیا۔ یہ نہیں کہا کہ بھلا اس برے معاشرے کے اندر اسلامی نظام کے قائم ہونے کی کیا توقع ہے۔ ممکن ہے آپ کہیں کہ یہ تو جو کچھ ہوا نبی ؐ کے عزم و ہمت سے ہوا، دوسرے یہ عزم و ہمت کہاں سے لاسکتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ دوسروں سے پیغمبرؐ اور صحابہ کرام کے عزم و ہمت کی توقع نہیں ہوسکتی لیکن یاد رکھیے کہ ہمارے سامنے کام بھی اتنا مشکل نہیں ہے جتنا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے سامنے تھا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے کفر اور جاہلیت سے کشمکش کی اور اس کو مٹا کر اس کی جگہ اسلام کو قائم کیا، ہمیں کفر و جاہلیت سے لڑنا اور اس کو شکست دینا نہیں ہے بلکہ صرف جمود اور جہالت سے کشمکش کر کے اپنے معاشرے کو اٹھانا اور بیدار کرنا ہے۔

اس معاشرے کے اندر ان تمام خرابیوں کے باوجود جن کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے، اسلامی پہلو سے بہت سی ایسی خوبیاں بھی ہیں جن سے وہ لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو اس کی اصلاح کا کام کرنا چاہیں۔ اس وجہ سے میں اس معاشرے کی طرف سے تو مایوس نہیں ہوں، اس کے اندر اسلام کے لیے کام کرنے کے بڑے

امکانات ہیں اور میں توقع رکھتا ہوں کہ اس کو ایک اسلامی معاشرہ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے البتہ جس چیز کی کمی ہے وہ یہ ہے کہ اس مقصد عالی کے لیے انبیاء علیہم السّلام کے طریقہ پر بے لوث و بے غرض ہو کر صرف اللہ کے لیے کام کرنے والے ابھی ہمارے اندر پیدا نہیں ہوئے ہیں۔ اگر اس طرح کے لوگ ہمارے اندر پیدا ہو جائیں تو پردہ غیب کے حالات کا علم تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے لیکن توقع یہی ہے کہ تمام مزاحمتوں کے باوجود اس معاشرے کے اندر بہت جلد اسلامی طرز کی تبدیلی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس وجہ سے معاشرہ کے حالات سے دل شکستہ اور مایوس ہونے کے بجائے کوشش اس بات کے لیے ہونی چاہیے کہ جو لوگ اسلام کے لیے کچھ کام کرنا چاہتے ہیں وہ انبیاء علیہم السلام کے طریقہ کار کو سمجھیں اور اس کو اپنائیں۔ اسلامی نظام دنیا میں صرف انبیاء علیہم السّلام کے طریقہ کار ہی پر گامزن ہونے سے وجود میں آ سکتا ہے دوسرے طریقے اس مقصد کے لیے بالکل بیکار ہیں۔

جو لوگ اسلامی نظام کو اب لبعد از وقت کی ایک چیز سمجھتے ہیں اور اس بنیاد پر یا تو اس کو بحیثیت ایک نظام کے موجودہ دور میں قابل اعتنا سمجھتے ہی نہیں یا سمجھتے ہیں تو اس شرط کے ساتھ کہ زمانہ کے بدلے ہوئے حالات کے مطابق اس میں ترمیم کر دی جائے، ہمارے نزدیک ان کی یہ غلط فہمی بیشتر اسلام اور اسلامی نظام سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ انھوں نے جو تعلیم پائی ہے اس نے اسلام کے خلاف ان کے ذہنوں میں بے شمار قسموں کی غلط فہمیاں بھر دی ہیں جن کے دور کرنے کی کوئی مؤثر کوشش اسلام کے حامیوں کی طرف سے نہیں کی گئی ہے۔ موجودہ دور میں اسلامی نظام کے قیام کے لیے ان غلط فہمیوں کو دور کرنا ضروری ہے اور یہ کام ان تھک کوشش اور منظم علمی و فکری جدوجہد کا طالب ہے۔ اس کام کی راہ میں جو مشکلات ہیں وہ بے اندازہ ہیں لیکن ان مشکلات سے بھی مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اگر اسلام کے لیے کام کرنے والے جدوجہد کی صحیح راہ اختیار کر لیں تو غلط فہمیوں کے اس جنگل کو بھی صاف کرنے میں زیادہ دن نہیں لگیں گے لیکن بہرحال یہ راہ صبر آزما ہے اور جو لوگ جلدی نتائج حاصل کر لینے کے لیے بے قرار ہوں وہ اس راہ کو مشکل سے اختیار کرنے پر راضی ہوں گے۔

آخر میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ حالات خواہ کتنے ہی خراب ہوں، کامیابی کے امکانات

کتنے ہی کم ہوں، لیکن اسلامی نظام کے لیے کوشش کرنا، محض کوشش برائے کوشش کے حکم میں نہیں ہے بلکہ یہ عین ہمارے ایمان واسلام کا تقاضا ہے۔ جو لوگ حالات کی خرابی کے عذر کی بنا پر مایوس ہو کر بیٹھ رہیں گے وہ عنداللہ اس مایوسی کے سبب سے مجرم ٹھہریں گے۔

کیا فرشتے غیر مکلّف ہیں؟

سوال: تدبر قرآن کی جو قسط مئی ۶۱ء کے 'میثاق' میں شائع ہوئی ہے اس کے صد ۱۲ پر آپ نے لکھا ہے کہ "قرآن مجید نے مکلف مخلوقات کی حیثیت سے تین مخلوقات کا ذکر کیا ہے۔ فرشتے، جنات اور بنی آدم"۔ مکلف سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ کیا فرشتے بھی جنوں اور انسانوں کی طرح اختیار رکھتے ہیں اور کیا وہ بھی بدی کا ارتکاب کر سکتے ہیں؟ اگر آپ کا مطلب یہی ہے تو اس کی وضاحت فرمائیے۔ اس لیے کہ یہ بات عام خیال کے بالکل خلاف ہے۔

جواب:۔ مکلّف مخلوقات سے میری مراد وہ مخلوقات ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت واطاعت کا حکم دیا ہے اور ساتھ ہی ان کو اختیار وارادہ کے شرف سے بھی نوازا ہے۔ میرے نزدیک فرشتے ذی ارادہ وذی اختیار مخلوق ہیں۔ یہ شجر وحجر کی طرح اختیار وارادہ سے محروم نہیں ہیں، قرآن مجید میں ان کی جو صفات بیان ہوئی ہیں ان سے مجھ پر یہی حقیقت واضح ہوئی ہے۔

رہا یہ سوال کہ کیا وہ انسانوں اور جنوں کی طرح معصیت کا بھی ارتکاب کر سکتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں، لیکن معصیت کا ارتکاب نہ کر سکنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ اختیار وآزادی سے محروم رکھے گئے ہیں بلکہ اس کی وجہ ان کی فطرت کی پاکیزگی ہے۔ ان کی خلقت چونکہ نور سے ہوئی ہے اس وجہ سے انسان یا جنات کی طرح ان کے اندر سفلی میلانات نہیں ہیں بلکہ ان کا میلان ہمیشہ اللہ تعالیٰ اور اس کے تجلیات وانوار کی طرف رہتا ہے۔ وہ اللہ کے رنگ میں اس طرح رنگے ہوئے ہیں اور ان کی اپنی فطرت کے لحاظ سے یہ رنگ ان کو اس درجہ محبوب ومرغوب ہے کہ کسی دوسرے رنگ سے اپنے کو آلودہ کرنے کا وہ تصور نہیں کرتے۔

فطرت کی یہ پاکیزگی اور شے ہے اور شجر وحجر کی بے اختیاری بالکل دوسری چیز ہے۔ میں نے اسی پہلو کو سامنے رکھ کر فرشتوں کو مکلّف مخلوقات میں شامل کیا ہے۔

نقد ونظر

نعیم العطار ترجمہ کتاب الشفاء

تصنیف : قاضی عیاض مالکی اندلسی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ : مفتی غلام معین الدین نعیمی

صفحات :۔ ۴۱۶　قیمت : چار روپے

ناشر　ادارہ نعیمیہ رضویہ، ہفت روزہ سواد اعظم، موچی گیٹ لاہور

مشہور محدث وفقیہہ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب "کتاب الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰ" سے اہل علم بخوبی واقف ہیں۔ اس کتاب میں مصنفؒ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ ومقام کو واضح کرنے کی سعی کی ہے اور حضورؐ کے جو حقوق ایک مسلمان پر واجب ہیں، ان کو بیان کیا ہے۔ یہ بات تو واضح ہے کہ ایمان کی راہ میں پہلا قدم خدا ورسول کے حقوق کو پہچاننا اور ان کو ادا کرنا ہے اگر آدمی کا یہی قدم غلط اُٹھ جائے، وہ خدا اور رسول کے حقوق کے تعین اور ان کی ادائگی میں غلطی کر جائے تو پھر دین کی راہ میں اس کا کوئی قدم بھی صحیح نہیں اُٹھ سکتا۔ اس غلطی کے نتیجہ میں جو گمراہیاں ظہور میں آتی ہیں ان کی مثالیں پچھلی امتوں میں بھی موجود ہیں اور مسلمانوں کے اندر بھی موجود ہیں۔

قاضی عیاضؒ کی کتاب کا موضوع اس اعتبار سے نہایت اہم ہے کہ وہ مسلمانوں کی دنیا وعاقبت سے براہ راست متعلق ہے اور اس امر میں شبہ نہیں ہے کہ یہ نہایت ہی مفید اور بابرکت کتاب ہے لیکن بعض لوگوں نے اس کے متعلق اس کی اصل حیثیت سے زیادہ حسن ظن قائم کر رکھا ہے جو کتاب کے مطالعہ کے بعد قائم نہیں رہتا۔

زیر نظر کتاب "نعیم العطار" کتاب الشفا کے جزو اوّل کا اُردو ترجمہ ہے۔ اس جزو میں چار ابواب ہیں۔ پہلے باب میں مصنفؒ نے قرآن مجید کی وہ آیات جمع کی ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حضور کی قدر ومنزلت کا اظہار ہوتا ہے۔ دوسرے باب میں آنحضورؐ کے دینی و دنیوی فضائل اور شمائل وعادات کا ذکر ہے۔ تیسرے

باب میں وہ احادیث جمع کی گئی ہیں جن سے خدا کے ہاں حضورؐ کی قدر و منزلت واضح ہوتی ہے اور چوتھا باب معجزات کے بیان پر مشتمل ہے۔

ترجمہ کی یہ جو خصوصیت بتائی گئی ہے کہ وہ ایسا رواں ہو کہ اس پر اصل کا شبہ ہو تو یہ خاصیت اس ترجمہ میں نہیں ہے۔ عربی کے ثقیل الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ کتاب کا کاغذ گھٹیا ہے، طباعت بھی معیاری نہیں۔ سرورق رنگین ہے۔

• اشتراکیانِ روس اور مادہ پرستوں کو دعوتِ اسلام
• عالمی مشکلات کا یقینی حل

ترتیب: ابو احمد عبداللہ لودھیانوی

شائع کردہ: شعبہ نشر و اشاعت دار العلوم نعمانیہ گوجرانوالہ

مذکورہ بالا کتابیں اس احساس کے ساتھ شائع کی گئی ہیں کہ مسلمان قوم جس کا مرتبہ و مقام یہ تھا کہ وہ اللہ کے دین کو دنیا کے کونے کونے میں پھیلانے کا فرض منصبی ادا کرتی، اپنی ان ذمہ داریوں سے بالکل بے خبر ہے، حالانکہ دوسرے مذاہب کے مشنری اپنے مذاہب کی خدمت کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ مولف کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اسلام ایک عقلی دین ہے اور موجودہ عقلی دور میں اسے پیش کرنے کا کام اگر ٹھیک طریقہ سے سرانجام پائے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ دنیا کی بیشتر آبادی اسے قبول نہ کرے۔ مولف یہ رائے بھی رکھتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں دوسرے نظامہائے فکر ناکام ہو گئے ہیں اور دنیا از خود چند عالم گیر اصولوں کے تحت زندگی بسر کرنے کی ضرورت محسوس کر رہی ہے۔ یہ ضرورت چونکہ اسلام بطریقِ احسن پوری کر سکتا ہے اس لیے مسلمانوں کو عقلی انداز میں دین کو پھیلانے کی جدوجہد کرنی چاہیے۔ مصنف کا یہ احساس ہمارے نزدیک نہایت قابل قدر ہے، اور ہم اس رائے سے پوری طرح متفق ہیں کہ دین کو عقلی استدلال کے ساتھ پیش کرنے کی جتنی ضرورت اب ہے، شاید اتنی پہلے کبھی نہ تھی اور دین کی تبلیغ کا کام اتنا اہم

کہ قوم کو واقعی اپنی پوری طاقت اس مقصد پر صرف کرنی چاہیے۔

مولف نے تبلیغ دین کی ایک مہم چلانے کی خاطر پروگرام یہ بنایا ہے کہ اسلام کی دعوت کو پیش کرنے والی کتابیں اس طرز پر تحریر کی جائیں کہ ان میں دوسرے اہل علم وفکر کے اچھے اچھے مضامین جمع کر دیے جائیں تاکہ جو عمدہ مطالب اس وقت متفرق کتابوں میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں وہ یکجا ہو جائیں۔ مصنف کا یہ خیال بھی ہے کہ چونکہ ان کتابوں کے مخاطبین (یعنی غیر مسلم یا مسلم مادہ پرست حضرات) ان کتابوں کو از خود خرید کر پڑھنا گوارا نہیں کریں گے اس لیے یہ کتابیں بلاقیمت تقسیم کی جائیں۔ چنانچہ ان کتابوں میں یہ اپیل بھی کی گئی ہے کہ اہل خیر مولف کی مالی امداد کریں تاکہ وہ اپنی تصنیفات کی اشاعت کا اہتمام کر سکیں۔

ہمارے نزدیک مولف کا یہ پورا پروگرام نظر ثانی چاہتا ہے۔ اوّل تو یہ حقیقت سامنے رہنی چاہیے کہ ایک کتاب کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ مصنف اپنا مدعا اس میں علمی وعقلی رنگ میں حسنِ ترتیب کے ساتھ پیش کرے۔ اچھے سے اچھے مضامین اگر بے ربط طریقے سے جمع کر دیئے جائیں تو کتاب قاری پر کوئی اچھا اثر نہیں چھوڑ سکتی۔

دوسرے ہم یہ رائے رکھتے ہیں کہ عوام سے امداد کی اپیلیں کر کرکے کتابوں کی مفت تقسیم کا اہتمام کرنا بجائے خود دین کے وقار کے خلاف ہے۔ ایک ایسی کتاب جو قابلِ قدر فکری مواد اچھے اسلوب میں پیش کرتی ہو، عوام میں اپنا مقام خود پیدا کر لیتی ہے۔ اس لیے کتابوں کی اشاعت میں کوشش اس بات کی ہونی چاہیے کہ وہ ایسے معیار کی ہوں کہ وہ از خود عوام میں قبولیت حاصل کریں۔

زیر نظر دونوں کتابیں، جو علی الترتیب ۳۳۶ اور ۲۴۸ صفحات پر مشتمل ہیں، بنیادی طور پر یہ دعوت دیتی ہیں کہ چونکہ دوسرے نظام دنیا کے مسائل کو حل کرنے میں ناکام ہو چکے ہیں اس لیے اب دنیا کو اسلام کی طرف لوٹنا چاہیے کیونکہ یہ خدا کا کامل دین ہے اور اپنے اندر انسان کی ہر زمانے کی ضروریات کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ بس اسی مضمون کو مرتب نے پھیلایا ہے اور اپنے خیالات کے ساتھ ساتھ مختلف دوسرے اہل علم کی کتابوں کے صفحات کے صفحات نقل کرتے چلے گئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کتاب میں حسنِ ترتیب یا نظم کو تلاش کرنا بے سود ہے، ایک ہی بات لوٹ لوٹ کر اتنی بار سامنے آتی ہے کہ آدمی اکتا اکتا سا جاتا ہے پھر عقلی استدلال کی بھی بڑی کمی محسوس ہوتی ہے۔ مرتب کا لب ولہجہ بعض مقامات پر

اس طرح کا ہوگیا ہے جیسے وہ دنیا کے حکمرانوں، اقوام متحدہ کے ارکین اور اشتراکیوں کو خوشامد کر کے مسلمان بنانا چاہتے ہوں۔ ہمارے نزدیک دین کی دعوت کو پیش کرنے کا یہ انداز صحیح نہیں ہے۔
دونوں کتابیں مجلد ہیں۔ مولف کا خلوص اور ان کی محنت دونوں چیزیں بہرحال قابل داد ہیں۔

● پیغمبر عالمؐ

تالیف :۔ مولانا عبدالستار خاں نیازی
صفحات :۔ ۲۴ قیمت چھ آنے
شائع کردہ :۔ مطبوعات خلافت پاکستان متصل برکت علی اسلامیہ ہال، لاہور۔

یہ کتابچہ ایک مقالہ ہے جو فاضل مصنف نے انٹرنیشنل سیرت النبی کانفرنس منعقدہ کراچی میں پڑھا تھا۔ اس کتابچہ میں فاضل مصنف نے عقلی استدلال سے یہ بتایا ہے کہ انسانی عقل ناقص اور اس کا علم ناتمام ہے۔ انسان جب تک محض عقل ہی کو رہنما بناتا ہے تو وہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہتا ہے۔ اس کے علم و عقل کو کمال اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ خدا کی وحی سے ہدایت حاصل کرے۔ فاضل مصنف کے نزدیک آج دنیا کے بنیادی مسائل تین ہیں۔ اخوت انسانی کا نصب العین، صالح حکومت کا قیام اور انسان کی حریت فکر۔ اور ان مسائل کا حل صرف نبی آخر صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی سے ممکن ہے۔ فاضل مصنف کا یہ تبصرہ کتنا درست ہے کہ :۔

> "قیام پاکستان کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہ تھی کہ مسلمان بجز خاتم النبیینؐ کی تعلیمات کے اپنی ذاتی اور اجتماعی زندگی، اپنی قومیت، اور اپنی سیاست، اپنے وطن اور ترقی کے لیے کسی اور معیار کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ آج تک پاکستان میں جو خلل پیدا ہوا اس کی بنیادی وجہ سوائے اس کے نہ تھی کہ ہم نے اپنے ہر مسئلہ میں ہر پہلو سے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں کچھ کوتاہی کی۔ پاکستان میں کوئی موجودہ خلل اس وقت تک دور نہیں ہوسکتا جب تک ہم اس کو دور کرنے کے لیے آخری نبیؐ کی تعلیمات کی جانب رجوع نہیں کرتے۔" (ص ۲۲)

ہم اس کتابچہ کو اپنے موضوع پر ایک مفید چیز سمجھتے ہیں۔ اس کا کاغذ اور کتابت اچھی ہے لیکن تصحیح کا اہتمام شاید نہیں کیا گیا، اس لیے غلطیاں کافی ہیں۔

مکتبہ میثاق کی پہلی پیشکش

مولانا امین احسن اصلاحی ،

کی تفسیر

تدبر قرآن

کا ایک نمونہ

"تفسیر آیت بسم اللہ و سورہ فاتحہ"

مطالب کی تفصیل درج ذیل ہے :

مضامین آیت بسم اللہ • اس آیت کی تاریخی حیثیت • یہ آیت دعا ہے
• آیت کے اسمائے حسنیٰ • قرآن مجید میں اس آیت کی جگہ

مضامین سورہ فاتحہ • سورہ کا مضمون • سورہ کا اسلوب
• الفاظ اور جملوں کی تشریح • سورہ کا استدلالی پہلو
• رسالت کی ضرورت پر ایک دلیل • سورہ پر دیباچۂ قرآن ہونے کی حیثیت سے ایک نظر • سورہ کا تعلق بعد کی سورہ سے

اس کتاب کو خود پڑھیے اور اپنے دوستوں کو پڑھنے کیلئے دیجیے تاکہ قرآن کریم کے سمجھنے کا

ذوق پیدا ہو

تقطیع ۲۰×۲۶/۸ صفحات ۳۶ ، ھدیہ ۱۲ آنے علاوہ محصول ڈاک ۔ محصول ڈاک بیک پوسٹ ار رجسٹری ۶ر

سرورق خوبصورت ، طباعت و کتابت دیدہ زیب ،

ملنے کا پتہ :- مکتبہ میثاق ۔ رحمان پورہ ۔ اچھرہ ۔ لاہور